چاندنی اور زنجیریں

اختر سلیمی

نیا ناشر
لاہور

چاندنی

چاندنی اور زنجیریں

زنجیریں

افسانے اور ڈرامے

اختر سلیمی

نیا ناشر لاہور

حقوق محفوظ

قیمت دو روپے

انشا پریس اردو بازار لاہور میں
باہتمام رحمان مذنب پرنٹر پبلشر
شائع ہوئی

نشانات	عنوانات
۹	میری آہیں — میرے نالے
۳۶	ایک گیت — ایک شعلہ
۶۷	چھیماں
۸۷	بھدّی لڑکی
۱۱۷	چاندنی اور زنجیریں
۱۲۵	آندھی اور بگولے
۱۴۳	مداوا

اُس افسانے کے نام ــ

جس نے مجھ سے سینکڑوں" افسانے تخلیق کرڈالے

مجھے کچھ آپ سے اُمیدِ وفاداری نہیں
ورنہ کچھ بات نہیں عشق کا دعوےٰ کرنا

رُوٹھے ہم سے اَور غیروں سے لگالی اخترؔ
مجھ کو زیبا نہیں اظہارِ تمنّا کرنا

میری انتہائے نگارش یہی ہے
تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

میری آہیں ـــــ میرے نالے

وہ گرد سے اٹی ہوئی کشادہ سڑک کو عبور کرنے کے بعد اوندھے سیدھے راستے پر چلنے لگا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک بوڑھے شیشم کے پاس کھڑا ہو گیا جس کی شاخوں نے مارے شرم کے گردنیں جھکا لی تھیں اور جو ڈھیلا ڈھالا بڑا بے ہنگم سا دکھ رہا تھا۔ اُس کے سرسبز و شاداب پتے الفریڈ کی منگیتر لیزا کی طرح زرد ہو رہے تھے۔ اور وہ ٹپ ٹپ گر رہے تھے جیسے کسی بے کس کے آنسو۔ الفریڈ نے یونہی ایسے محسوس کیا جیسے یہ ناگاساکی اور ہیروشیما کی تباہی کی بے بس عورتوں اور بچوں کے آنسو ہیں۔ شوخ ہوا سے وہ دُور دُور تک پھیل گئے تھے اور ابھی تک کسی دیوانے کے آنسوؤں کی

طرح بہتے جا رہے تھے ۔ راہی اس کے پاس سے مُسکراتے گزر جاتے وہ کیا جانیں کہ یہ بوڑھے شیشم سے بچھڑے ہُوئے پتے نہیں ــــ سفید چمکتے ہُوئے موتی ہیں، نرگسی پھولوں پر پڑے ہُوئے شبنم کے قطرے ہیں، نیلگوں آسمان پہ جھلمل کرتے ستارے اور کورپانی بوڑھی ماؤں، جوان بہنوں اور شیر خوار بچوں کے تڑپتے ہوئے آنسو ۔

جب وہ جواں سال تھا تو اس کا پُرکیف راگ، دلفریب نغمہ اور سرشار زمزمہ کوریاپسس (Coreopsis) کے سُرخ اور زرد شگفتہ پھولوں اور (کولیس colcus) کے رنگ برنگے پھولوں کی شیریں اداؤں، شوخیوں اور سحر طرازیوں میں اور بھی دلکش ہو جاتا ۔ اُن کی سحر آفریں اداؤں کی مدح سرائی میں جب شیشم کا بوڑھا درخت زمزمہ پرداز نظر آتا تو بلا شک وشبہ کہا جا سکتا تھا کہ براؤننگ، بائیرن، شیلے اور کیٹس نے اپنی نظمیں یہیں بیٹھ کر لکھی ہونگی ۔

براؤننگ، بائیرن، شیلے اور کیٹس نے گو وہاں بیٹھ کر نظمیں اور گیت نہ لکھے ہوں مگر الفریڈ واٹ نے یہاں بیٹھ کر اپنی نظم ضرور لکھی تھی جس کا عنوان تھا "لبنزارا ایلے" اور جس کے گول مٹول چہرے پہ تبسم کی لہریں ناچا کرتی تھیں، جس میں کیف و سُرور کا سمندر موجزن تھا جس کی محشر بدوش انگڑائیاں الفریڈ کو بے بس کر دیا کرتی تھیں، جو نکہت لٹاتی، شیریں ادا چلتی تو اپنے پیچھے دلفریب موسیقی چھوڑ جاتی، جس میں رنگینیوں کا طوفان پنہاں ہوتا اور جس کے ہاتھ ہلنے سے ہوا میں ایک ترنم سا

پیدا ہو جاتا تھا، جو تمنا اور حسین سے مست تھی، جو ابھی عنفوانِ شباب پر تھی، جس کے بال سیاہ ملائم لانبے اور چمکدار تھے، جس کے حسن میں نزاکت اور انکساری تھی، جس کی کرنجی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی، جس کی انسانیت اب افلاس میں جل کر خاک سیاہ ہو چکی تھی، جس کو اقتصادی بدحالی کے سیلاب نے دریائے تفکر میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کر دیا تھا، جس کے خلاف اب الفریڈ نفرت و عناد کے جذبات لئے ہوئے تھا جس نے الفریڈ کی اُمیدوں کے تمام ہیولے ہوا میں تحلیل کر دیئے تھے اور جس کے متعلق الفریڈ نے کبھی سوچا تھا کہ وہ اس کے سہارے اپنی زندگی کی اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کو رنج والم کی اُونچی اُونچی دُور دُور تک پھیلی ہوئی اُٹھتی بیٹھتی موجوں سے صحیح و سالم نکال لے جائے گا اور جو اب الفریڈ کے لئے اندرائن کا پھل تھی جو باہر سے دیکھنے میں بے حد خوبصورت ہوتا ہے۔ اور اندر سے سخت ناگوار قسم کا تلخ۔

الفریڈ کا سفینہ ان سفینوں میں سے تھا جو کنارے کے قریب آکر ڈوب جاتے ہیں۔ اُس نے سوچا لیبز ارا بیلے آخر ایک عورت ہی نکلی۔ صرف عورت! اور پھر اُسے جرمنی زبان کا مشہور مقولہ یاد آگیا۔ "زمین، آسمان اور دوزخ یہ تینوں چیزیں ایک لفظ کے اندر محدود ہیں اور وہ لفظ ہے "عورت" عورت کے لفظ سے وہ کانپ اُٹھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ رات کافی سرد ہو رہی ہے وہ کوٹ کے اندر سکڑ گیا اور اُس نے کوٹ کے بوسیدہ پھٹے ہوئے کالر کو کھول کر اُونچا کر لیا۔ وہ پھر سوچنے لگا کہ یہ لیبز ارا بیلے کبھی نہیں ہو سکتی یہ تو "جین ڈی لاموٹ" تھی جو اپنی فریب کاریوں

کی وجہ سے شاہی محلات کی زینت بنی رہی تھی یہ تو اسرائیل کے بادشاہ "گرہاب" کی بیوی تھی جس نے بہت سے معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا، یہ تو "میکری ٹیٹا" تھی جس نے زہر خورانی اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں سے ہلاک کرنے میں ملکہ حاصل کیا تھا، یہ تو جو یہ "جین لیگ"، "بریڈ" اور "بیلی گیونس" تھی جنہوں نے اپنے شوہروں کو قتل کرنے کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا، یہ تو فرانس کی دھوکے باز "میڈم ہمبرٹ" اور "میڈم بیاڈا" تھی، یہ تو جرمنی کی فریب کارہ "مارتھا کوفر" تھی، یہ تو انگلستان کی "مسز پینگ" اور "مسز گورڈن" تھی، یہ تو امریکہ کی شاطر عورت "مسز جاؤڈک" تھی؛ یہ تو "کلو پٹرا" اور بادشاہ ہنری کی بدچلن بیوی "لیمورا" تھی، یہ تو شاہ بائی زنطہ کی بیوی ملکہ "تھیوڈرا" تھی جس کے عشرت کدہ میں ہر رات خفیہ طور سے ایک پسندیدہ نوجوان آتا تھا اور جس کو تمام رات دادِ نشاط دینے کے بعد علی الصبح قتل کر کے دریا میں بہا دیا جاتا تھا، یہ تو مصر کی ملکہ "نفرتی تی" تھی جس نے ہزاروں مردوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا، یہ تو وہ عورت تھی جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ نے کہا تھا۔

زن دوست بود دے زمانے		تا جز تو نیافت مہربانے
چوں در برے دیگرے نشیند		خواہد کہ ترا دیگر نہ بیند

(عورت کچھ عرصہ تک تیرے سوا کسی پہ مہربان نہیں ہوتی لیکن جب وہ دوسرے کے آغوش میں جا بیٹھتی ہے تو دوبارہ تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی)

اور جس کا نقشہ جرمنی فلسفی شوپنہاور نے یوں کھینچا ہے "عورت نام ہے ایک ایسی بے ہنگم مخلوق کا جس کے کندھے چھوٹے چھوٹے، ٹانگیں نیچی نیچی کولھے پھیلے پھیلے اور جسم گویا ایک تودۂ لحیم شحیم۔ یہ وہ عورت تھی جس کو شیکسپیئر نے "کمزوری" کے نام سے پکارا تھا۔ لنیرا اسٹیلے تو وہ تھی جو اس کے دوست سیمپلسن کی بیوی اور ازابیلا کی چھوٹی بہن تھی اور جس نے اپنی سالگرہ کے دن اپنی ہی طرح اُسے بھی ایک نئی زندگی بخشی تھی جس نے اُسے اپنی آنکھوں کے کٹوروں سے تا ابد نشہ رہنے والی شراب پلائی تھی اور جس کے گالوں میں ہلکی سی مسکراہٹ سے دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے تھے جو ذرا سا ہنسنے سے اور زیادہ عمیق گہرے ہو جاتے۔

جب سیمپلسن نے الفریڈ کو اپنی سالی لنیرا کی سالگرہ پر مدعو کیا تھا۔ یوں تو لنیرا کے بابا بابی کو دعوتی کارڈ بھیجنے چاہیئے تھے مگر چونکہ سیمپلسن کی بیوی نے دعوت کا اہتمام کیا تھا اس لیئے سیمپلسن اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار سمجھتا تھا لہذا ازابیلا اور اُس کے خاوند نے بھی اپنے خویش و اقارب کو شرکت نامے بھیجے۔ اِس دعوتی کارڈ کو حاصل کرنے کے فوراً بعد الفریڈ کچھ دیر کے لیئے خلا میں پھیلے ہوئے دھندلکوں میں اپنی چمکیلی آنکھیں گاڑھے سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ لنیرا کو وہ کونسا تحفہ پیش کرے۔ وہ نہ صرف لنیرا کی طبیعت سے ناواقف تھا وہ اس کے لباس اور شبیہہ تک سے ناآشنا تھا۔ وہ سوچنے لگا "جانے وہ کونسی شئے پسند کرے" وہ زیادہ سوچنے کا عادی نہ تھا اس لیئے اُس نے

جلد ہی فیصلہ کرتے ہوئے چٹکی بجائی اور اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی یہ مسکراہٹ کسی جذبۂ استبداد کو ظاہر کرتی تھی۔

کافی کی پیالیوں کے ساتھ چمچیوں کے ٹکرانے سے مدھ بھری کھنکھناہٹ نے بڑا پیارا سماں پیدا کر دیا اور جب اس دلنواز ساز میں لینرا کی شیریں آواز ابھرتی تو الفریڈ یوں محسوس کرتا جیسے Chansons de geste کے گیت گھول کر پی رہا ہو۔ الفریڈ بے حد متاثر تھا اور اس کی چیتے ایسی تیز آنکھیں لینرا کے لعلیں لبوں کو چھوتی ہوئیں اُس کے چاندنی ایسے سپید گالوں پہ اٹک گئی تھیں جن میں کھل کر مسکرانے سے دو چھوٹے چھوٹے مگر گہرے گڑھے پڑ جاتے۔ ان دو گڑھوں نے الفریڈ کے سینے میں ایک تلاطم سا ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ یہ عارض سیمیں کتنے پیارے تھے جیسے اوس میں بھیگے ہوئے کنول کے پھول۔ سمور کی کھال ایسے ملائم جگمگ جگمگ کرتے گالوں پر تحسین کی نگاہیں گاڑتے ہوئے الفریڈ نے کچھ کہنے کے لئے ذرا سے لب کھولے مگر کچھ کہے بغیر چپ ہو گیا۔ کہہ ہی کیا سکتا تھا حسن کے آگے عشق ہمیشہ سرنگوں رہا ہے۔ دوران خاموشی میں سیلسن کی آواز پیالیوں اور چمچیوں کی کھنکھناہٹ کو چیرتی ہوئی باہر کے دروازے تک جا پہنچی۔ "الفریڈ! یوں تو تمہارے ہر کام میں تمہاری ہر ادا میں ابتدا ہی سے جدت ہے مگر آج تو تم نے کمال کر دیا۔" الفریڈ یکلخت سب کچھ بھول گیا اور سر کو شدید جھٹکا دے کر اپنی ساری توجہ سیلسن کے

نفنوسے کی طرف مبذول کر دی۔ الفریڈ نے اس فقرہ پر گردن نہ جھکائی جیسا کہ ازبیلا کا خیال تھا بلکہ اُس نے اصیل مُرغ کی طرح سینہ اکڑاتے ہوئے ایسا زور دار قہقہہ لگایا کہ انا بیلا کو ارض و سما ہلتے ہوئے نظر آئے اُسے سخت غصّہ آیا اور الفریڈ کی اس واہیات حرکت پر دیر تک بڑبڑاتی رہی کمبخت اپنی غلطی پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آنا تھا تو نہ آتا۔ ایک تو سالگرہ کے دوسرے دن پہنچا ہے اور پھر ہاتھ لٹکاتا آگیا ہے جیسے یہ کوئی سیرگاہ ہے" ازابیلا دل ہی دل میں کڑھتی رہی اور الفریڈ نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "بھئی وہ تو اچھا ہوا تمہارے ہاتھ سے کھینچا ہوا نقشہ میرے پاس رہ گیا۔ ارے وہی جب ہم No sad songs for me لائٹ ہاؤس Light House سے دیکھ کر آ رہے تھے تو تم نے دو چار لکیریں کھینچ دی تھیں۔ بس اُنہی پر چلا آیا ہوں۔ کارڈ تو نہ جانے کہاں گم ہو گیا یہ نہ ہوتا تو شاید تمہاری آئندہ ملاقات تک یہاں پہنچ ہی نہ سکتا۔" ازابیلا ایک بار پھر بڑبڑائی۔ "کیسے باتیں کر رہا ہے جیسے ہم پہ بہت احسان کیا ہے۔ نہ پہنچتا تو ہمارا کونسا جہاز ڈوب جاتا۔"

ازابیلا کا جی چاہا کہ یہ سب کافی سیٹ کی پرچیں اور پیالیاں اُس کے سر پر دے مارے۔ کافی پوٹ میں پڑا ہوا گرم گرم سارا قہوہ اُس کی کھوپڑی پر انڈیل کر اوپر کرسیاں میزیں اور کمرے کا تمام فرنیچر رکھ دے اور پھر آگ لگا دے یا اس کے جی میں آئی کہ اُسے خوب زور زور سے گالیاں سنائے۔ کمینے، سفلے

گدھے کے بچے نہیں تو انسانیت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں مگر بیچاری کچھ بھی نہ کہہ سکی حالانکہ اُس کی چھاتی میں دبا ہُوا لاوا باہر نکلنے کے لیئے بُری طرح بیقرار تھا۔ دل میں اُٹھتے ہُوئے شعلوں کا طوفان چھُپا کر مُسکرایا جا سکتا ہے جیسے پریشان حال فن کار کا برش آئیل پینٹ سے کینوس پر مُسرّتیں بکھیر سکتا ہے یا جیسے پنجرے کی محبوس چڑیا چہک سکتی ہے گا سکتی ہے اور جب ازابیلا الفریڈ سے مخاطب ہُوئی تو اُس کے گیروے بادلوں کی رنگت ایسے ہونٹوں پر دل کو موہ لینے والی مسکراہٹ تھی۔ اسی مسکراہٹ کی اوٹ میں اُس نے الفریڈ پر یوں حملہ کیا۔ "مسٹر الفریڈ واٹ تم نے وہ تخالیف نہیں دیکھے جو کل لینزا کو اپنی سالگرہ پر ملے تھے" الفریڈ کا جی چاہا کہہ دے کو لیتے ایسے انوکھے ہونگے مگر اُس نے سوچا سیمپلن کی اور بات ہے اس سے تو وہ کافی بے تکلف ہے اور یہ عورت یونہی ناک منہہ چڑھائے گی۔ اُس نے کہا

"کہاں ہیں وہ؟ میں تو بھُول ہی گیا تھا۔"

ازابیلا جو طبعتاً بڑی بدمزاج زود رنج اور غصیل تھی باری باری تمام تحفے دکھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ نام لیتی جا رہی تھی "And quite flows the Don" یہ شولوخوف کا لازوال ناول ہے اور "مادام بوواری" فلوبیئر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں ناول لینزا کی بے تکلف سہیلی ریچل نے پیش لئے ہیں۔ یہ گھڑی رابرٹ نے دی ہے۔ یہ شیفر کا قلم ہے۔ یہ بھی اُس کی ایک سہیلی

نے دیا ہے۔ اسی طرح اُس نے کئی تحائف گنوائے لیکن الفریڈ کی توجہ اُن کی طرف کم اور لنیرا کے گالوں کی طرف زیادہ تھی اور پھر سب اُس کی پیروی میں باہر گراج کی طرف چل پڑے۔ گراج کے باہر ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا بالکل سپید جیسے ابھی ابھی بادلوں سے نکل کے آیا ہو اور اندر ایک کشتی نما کار پڑی تھی گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ازابیلا کہنے لگی۔ یہ کارٹن نے دیا ہے۔ لنیرا کے لئے بہت مُفید ثابت ہوگا شاید تم نہیں جانتے کہ لنیرا پولو کی بے حد مشتاق ہے اور اب وہ اپنا پُرانا گھوڑا بیچ دے گی۔ یہ ایسے بھاگتا ہے جیسے سیول پر ایٹم بم لئے ہوئے امریکن جہاز۔

"کلر! دیکھا یہ کتنی قیمتی ہے۔" اس طنزیہ فقرے میں گلہ تھا، شکوہ تھا جیسے وہ کہہ رہی ہے، تمہارا باپ اتنی بڑی انشورنس کمپنی کا مالک ہے جس کی شاخیں سارے کوریا میں پھیلی ہوئی ہیں جن میں کوریائی کام کرتے کرتے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں اور جن سے تمہارے باپ کو لاکھوں ڈالر ہر سال نفع ملتا ہے۔ پھر بھی تو ہاتھ لٹکاتا آ گیا ہے! شتر مرغ! تجھے اس سے کہیں اچھا تحفہ لنیرا کے لئے لانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تم سمپلسن کے یارِ غار بھی ہو۔ سمپلسن جو میرا خاوند ہے اور لنیرا جو سمپلسن کی بیوی کی بہن ہے! اُس کے لئے! اب سمجھے! شتر مُرغ!!!

"یہ ہیزل کے بڑے بھائی نے دی تھی"۔ جانتے ہو وہ کپڑے کی اُس ٹھی

مل کا مالک ہے جس کی دیوانداام مشینوں کے چھٹتے اعضا بہتے ہوئے آنسوؤں اور مہیب آوازوں کو اُبھرنے نہیں دیتے۔ ان کا ایک ایک پرزہ اتنا آتنا بڑا ہے کہ ایسے ہی اور کئی لاکھ انسانوں کے آنسوؤں کا سیلاب روک سکتا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ لینیرا کی شادی اُس کے ساتھ کر دی جائے۔" اگرچہ یہ فقرہ بالکل آہستہ سے کہا گیا تھا مگر البیلی اُفق جیسے گالوں پہ دوڑنے والی سُرخ لہر نے سب کو متنبہ کر دیا کہ لینیرا اس سے ناواقف نہیں۔

واپس آکر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے الفریڈ نے کہا "اجازت ہو تو میں بھی اس فہرست میں اپنا نام لکھوا لوں؟" وہ ان پرانی بوسیدہ گھسی پٹی باتوں کے کسی حد تک خلاف تھا مگر چونکہ لینیرا کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات تھی اور وہ اُس کی عادات سے بھی کچھ زیادہ واقف نہ تھا اس لئے احتیاطاً وہ اپنے ساتھ ہلکا سا مگر پُرمعنی تحفہ لے آیا تھا۔ ازابیلا ایک بار پھر جل بُجھ سی گئی۔ اُسے یونہی اس سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ سمپلسن اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا۔ الفریڈ نے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر اپنا ہاتھ لینیرا کی طرف بڑھا دیا۔ لینیرا کی نگاہیں جھک گئیں، اور الفریڈ کی نظریں یکبارگی پھر نقرئی ہونٹوں سے گزرتی ہوئی اُس کے گالوں کے گڑھوں میں گم ہو گئیں۔ ایک لمحہ کیلئے اُس نے سوچا "یہ گڑھے کہیں اُسکی حیات کا شیرازہ نہ بکھیر دیں"۔ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ وہ زیادہ سوچنے کا عادی نہیں تھا۔ اُس نے فوراً ہی اٹل فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ ان گڑھوں میں ایک بار ضرور کودے گا چاہے یہ بعد میں جان لیوا ہی کیوں نہ ثابت ہوں

الفریڈ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لینیرا جانتی تھی الفریڈ کی نگاہیں خلوص اور ہمدردانہ جواب کی منتظر ہیں۔ لینیرا نے اپنی لانبی گردن اٹھا کر لانبی پلکیں جھپکتے خلوص میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہا۔ "مجھے آپ کا تحفہ بے حد پسند آیا"۔ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولی "میں سمجھتی ہوں یہ تحفہ میری سالگرہ کے تمام تحائف سے اچھا اور قدر و منزلت کے قابل ہے" اور پھر وہ کونے پہ لکھے ہوئے حروف پڑھنے لگی۔ Lest you forget me جو یوں لکھے ہوئے تھے جیسے سانپ کے چلنے کی لکیریں "الفریڈ" الفریڈ صرف مسکرا دیا۔ سیمپلسن بھی مسکرا رہا تھا اور رازابیلا کا چہرہ غصّہ سے تمتما رہا تھا۔

اگر کسی کو کوئی ایسی شے مل جائے یا ملنے کی توقع ہو جس کا اُسے خیال تک نہ ہو جس کی اُسے امید تک نہ ہو تو یکدم اُس کے سینے میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ یہی کیفیت الفریڈ کی تھی وہ جب سے اپنے گھر واپس آیا تھا۔ اُس کے سینے میں گُدگُدی سی ہو رہی تھی اور ساتھ ہی اُس کے دِل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے، اُبھرتے اور گُم ہو جاتے جو دوسرے لمحہ سمندر کی لہروں کی طرح وہیں گُم ہو جاتے۔ دیر تک یہ کھیل جاری رہا کبھی وہ سوچتا مجھے ایسی نایاب شے مل گئی ہے جسے آج تک یونان کے مجسمہ ساز بھی پیش نہیں کر سکے، جس کا نقشہ رینش پال اور روش فوکرہ بھی اپنے تخلیقی ادب میں نہیں کھینچ سکے جس کی تعریف والٹیر، ہیوگو، لودلیئر، بلزاک، فلوبیئر اور زولا جیسے ادیبوں سے بھی نہیں

ہو سکی اور جس کے بغیر فلو لواٹرک گوگاں، وان گوگ مونے، سیزان، بینے اور دومیر جیسے فنکاروں کی فنکاری تشنہ تشنہ سی نظر آتی ہے اور جس کے بغیر ہالی ووڈ کی تصویریں بے مزہ، بے رنگ، بے کیف سی رہ گئی ہیں۔

وہ چاہتا، بھر بھاگ کر اُس کے پاس پہنچ جائے مگر فوراً اُسے ازابیلا کی جلتی ہوئی سُرخ سُرخ آنکھیں یاد آجاتیں۔ ایک بار اُس نے سوچا کچھ بھی ہو ابھی اُس سے ملنا چاہیئے مگر "وہ کیا خیال کرے گی"؟ اِس کا جواب اُس کے اپنے پاس بھی نہیں تھا۔ ڈرامائی فقرے بولنے کا وہ بالکل حامی نہ تھا اور ایسی کیفیت میں صاف صاف کہنے کی اس کو جرأت نہ تھی۔ جانے کیوں وہ انگلش پکچر Mater of life and death کے متعلق سوچنے لگا اور پُوری فلم اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس رات اُسے بار بار سُرخ انگاروں جیسے گالوں میں پڑے ہوئے گڑھوں کے اندر غوطے لگانے پڑے۔ وہ سوچنے کا عادی نہ تھا پھر بھی وہ ہر بار سوچنے پر مجبور ہو جاتا: "کیا میں آج لنیرا کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا"؟ گزرے ہوئے رنگین لمحے آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھومنے لگتے۔ لنیرا کی آواز کانوں میں گونجی: "آپ کتنی چینی پسند کریں گے؟ دو یا تین چمچ؟" الفریڈ مُسکرا دیا "چینی کی کیا ضرورت ہے"۔ سمپلسن ہنس دیا۔ ازابیلا کی بھنویں تن گئیں اور لنیرا جھینپ گئی اور پھر خود ہی لنیرا نے چینی کے دو چمچ بھر کر ڈال دیئے "عام طور پر لوگ اسی مقدار کو پسند کرتے ہیں"۔

اور پھر اُسے وہ لمحہ یاد آگیا جب لنیرا اُس کو اپنے گالوں کے گڑھوں میں ڈوبا دیکھ کر کچھ جھجکتی کچھ گھبرائی بھاگ جانا چاہتی تھی یا دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لینا چاہتی تھی مگر وہ ایسا نہ کر سکی جب ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں تو بیقراری کو چھپانے کے لئے اُس نے نیا حربہ استعمال کیا۔ آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" آواز کافی مدھم تھی "شکریہ" الفریڈ کہا اور پھر دو نو مسکرا دیئے اور الفریڈ محسوس کرنے لگا کہ گھنگھور گھٹا چھا گئی ہے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی ہے، املتاس کی شاخوں میں پھولوں کے زرد فانوس جھومنے لگے ہیں آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول اُسے بہت ہی بھلے معلوم ہوئے شمشاد کے پتے جو ایک طرف سے سبز اور دوسری طرف سے چاندنی ایسے سپید ہوتے ہیں اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے سُرخ زرد اور پیازی پھول ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ گیندے کے پھول بھی مُسکرا رہے تھے سمندر کی موجوں نے اُٹھ اُٹھ کر نظارہ فردوس دیکھا یہ سب کچھ لنیرا کی ایک ہی مسکراہٹ میں مدفون تھا۔ مگر شاید صرف الفریڈ کے لیئے

شام سے نصف رات اور نصف رات سے صبح تک وہ ایسی ہی لغو بے معنی سی باتیں سوچتا رہا۔ یہ تو نفسیات کا بابا سگمنڈ فرائیڈ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُس نے ایسا شعوری طور پر کیا یا لاشعوری طور پر۔ وہ صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ صبح جب اُس کی آنکھ کھُلی تو اُس نے بدستور اپنے آپ کو اُسی اُلجھن میں پھنسا پایا۔ دوسرا دن بھی یونہی گزرا، پھر شام ہوئی، پھر صبح، صبحیں ہوتی رہیں شامیں ہوتی

رہیں۔ اور اسی طرح دو ماہ گزر گئے۔

الفریڈ ہرٹ انسٹی ٹیوٹ کا پرانا ممبر تھا اور وہاں بلاناغہ جایا کرتا تھا مگر اس دوران میں وہ صرف پانچ دفعہ گیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ پھر بلاناغہ جانا شروع کر دیگا اور جب چھٹی بار گیا تو اُس نے سوچا شاید سمپلسن وہاں مل جائے شاید لنیرا اور پھر جانے کیا کیا سوچنے لگا۔

سمپلسن سے ملاقات ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ لنیرا کی سالگرہ کے بعد وہ سمپلسن سے صرف دو بار مل سکا تھا۔ اُسے مبہم سی امید تھی کہ سمپلسن اُسے مل جائیگا۔ کیونکہ اتوار تھا۔ یوں بھی تو اتوار کو ہرٹ انسٹی ٹیوٹ میں کچھ زیادہ ہی رونق ہوتی ہے۔ الفریڈ نے سوچا مجھے آج ضرور جانا چاہیئے۔ شاید لنیرا "پھر لنیرا" وہ گھبرا گیا۔ "نفسیات۔ سگمنڈ فرائیڈ۔ لنیرا۔ نفسیات۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ وہ سٹپٹایا۔ جیسا کہ اُس کے دل کی دھک دھک کہہ رہی تھی کہ وہاں اُسے لنیرا ضرور ملے گی۔ لنیرا مل تو گئی مگر اُسے دیکھ کر الفریڈ کے سینہ میں گدگدی نہیں ہوئی۔ اُس کے بدن پہ چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دل سیول کی طرح جل اُٹھا سیول جس کے شعلے آسمان کو چُھونے لگے تھے سیول جس کی آگ کے سیاہ اور کڑوے دھوئیں نے کھکھلاتے ہوئے چاند، ہنستے اور ناچتے ہوئے ستاروں کو ماتمی لباس پہنا دیا تھا۔ "سیول" بھی سرمایہ داروں کا نشانہ بنا تھا اور ایلفریڈ کا دل بھی، وہ ناچ رہی تھی، گا رہی تھی اور شراب پی رہی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اُسی "پاسنگ شو" کے ساتھ کر رہی تھی

جس نے اُس کی سالگرہ پر سُرمئی کشتی نما کار تحفہ کے طور پر دی تھی "اُف کتنا بڑا تحفہ تھا" جیسے جھُوٹ ہے۔

"آخر یونہی تو نہیں کوئی دے دیتا"۔ الفریڈ کے پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ وہ حسد کی آگ میں جلا جا رہا تھا۔ لنیرا ناچ رہی تھی اور یہ اُس کے ناچ سے بھی زیادہ تیزی سے بڑبڑا رہا تھا۔ مکارہ، عیارہ، ساحرہ، بیوفا، دغا شعار، یہ عورت ذات کتنی سفلی ہے۔ کچھ بھی ہو جائے کبھی مُنہ سے اظہارِ محبت نہ کرے گی ہمیشہ اشاروں، کنایوں سے کام لے گی تاکہ وقت آنے پر صاف انکار کر سکے اور اکڑ کر کڑکتی آواز میں کہہ سکے "میں نے کب تم سے کہا تھا کہ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں"۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے زیر و بم انسان کی سمجھ سے بعید ہوتے ہیں۔ کچھ اِسی قسم کا ماحول اور واقعات الفریڈ کے درپیش تھے۔ الفریڈ لنیرا کے متعلق اپنا نظریہ زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا جس نظریئے کو اُس نے ایک محکم اور سنگین چٹان سمجھا تھا وہ بُلبلا نکلا۔ "سراب محض دھوکا"۔ اس کی ساری استقامت ننھے ننھے دو گڑھوں کی ایک ہی جھلک سے لرز اُٹھی۔ چند دن بعد جب لنیرا نے اُسی برٹ انسٹی ٹیوٹ میں الفریڈ کو دیکھا تو اُس کی کرنجی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اُس کے دُھکتے ہوئے سُرخ گالوں پر ایک لہر دوڑ گئی۔ الفریڈ کی نگاہِ شوق نے اُس لہر کا پُورا پُورا

ساتھ دبا پھر وہ اُس کی کلائی پر بندھی ہُوئی موتیا ڈوری کے ساتھ چمٹ گئی پھر گھڑی پر جو سیمگوں بازو پہ ایسے دِکھ رہی تھی جیسے منجمد شبنم یا جیسے موتیا کی کلی رکھ دی ہو۔ لنیرا نے الفریڈ کو شراب کی دعوت دی تھی۔ دونوں شراب پی کر ناچنے لگے اور پھر لنیرا کی نقرئی آواز مدھم سُروں میں اُبھرنے لگی۔

تمہاری محبت میں مجھے خُدا مِل سکتا ہے۔

تُم مجھے ہماری مقدّس کتاب سے بھی زیادہ پیارے ہو۔

تُمہاری محبت میری تاریک زندگی کو چاند سے زیادہ روشنی بخش سکتی ہے

تمہیں دیکھتے ہی مجھے زندگی کے نشان نظر آنے لگتے ہیں۔

جب تم میرے سامنے نہیں ہوتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کوئی گلا گھونٹ رہا ہے۔

جیسے میرے گلے پر کوئی کُند چھُری چلا رہا ہے۔

تم میرے ہو، تم میرے ہو، میری محبت تمہیں کہیں جانے نہیں دے گی۔

یہ گیت تحت الشعور سے اُبل اُبل کر اُس کے ہونٹوں تک آیا تھا۔ وہ تھک کر پڑے کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ وہ بہت ناچے تھے۔ لنیرا کافی خوش نظر آ رہی تھی اور اُس کے گال دھکتے ہُوئے انگاروں کی طرح چمکنے لگے تھے۔ الفریڈ بھی کافی حظ اُٹھا چکا تھا۔ اتنا کہ اُس کے تخیّل میں بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ کہ لنیرا بھی اتنی مہربان اور رحمدل ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہیں یہ دھوکا تو نہیں محض سراب تو نہیں

اگر نہیں تو اس دن پاسنگ شو...... اُسے غصہ آگیا۔ پاسنگ شو کا بچہ شتر مرغ تا!!
آئندہ کبھی نظر اُٹھا کے دیکھا اُس شتر مرغ نے تو کھوپڑی توڑ ڈالونگا کمینے کی"۔
اور پھر الفریڈ بڑی جاں گسل مسکراہٹ لبوں پہ لاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کونسی کار
پسند ہے؟ موریس، ہڈسن، بیوک یا فورڈ؟" دراصل اُسے کوئی بات سُوجھ
ہی نہ رہی تھی۔ اُس کا خیال ہر بار اُس دن والے پاسنگ شو کی طرف چلا جاتا۔
اور پیٹ میں بل پڑنے لگتے جو اُسے کافی تکلیف پہنچاتے۔

اُس نے اپنے آپ کو روکا تسلّی دی اور ملامت کی "میں تو جذباتی نہیں
ہوں اور نہ زیادہ سوچنے کا عادی۔ مجھے ماضی کے متعلق کچھ نہیں سوچنا
چاہیئے۔ میں کتنا بیوقوف ہوں۔ ماضی جو ہوتا ہی بھول جانے کے لئے ہے"۔

"کوئی نہ کوئی بات ہونا ہی چاہیئے تھی اور کچھ نہیں تو کاروں کا ذکر ہی
سہی۔ منہ سی کر بیٹھے رہنا بھی تو معیوب ہے اور پھر کہیں مجھ کو "بور" سمجھ بیٹھتی"
لنیرا مسکرائی۔ "مجھے تو ان میں کوئی بھی پسند نہیں"۔ موریس تو بالکل کھلونا ہے۔ ہڈسن
کچھ اچھی ہے۔ مگر قیمت بہت زیادہ ہے۔ فورڈ کے تو پرزے ہی نہیں ملتے
اور بیوک والے تو ہر سال نیا ماڈل تیار کر کے پیسے بٹورنا ہی جانتے ہیں۔ ہاں
مجھے ایک گاڑی پسند ہے۔ دیکھنے میں اتنی خوبصورت نہیں لیکن چلنے میں کمال
ہے اور قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں۔ جانتے ہو میں کس گاڑی کے متعلق کہہ رہی
ہوں؟ "واکس ہال"۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔ الفریڈ نے پھر ننھے ننھے گڑھوں

میں غوطہ لگایا اور سوچنے لگا۔ "وہ شتر مرغ کے ساتھ کیوں یہاں آئی تھی؟ یہ شبہ اسکے دل پر سرطان کی طرح جمٹ گیا تھا۔ اُسکے باوجود لنیرا سے کچھ پوچھنے کی اُسے جرأت نہ ہُوئی اور نہ لنیرا نے گڑھے مُردے اکھیڑے۔ وہ دیر تک یونہی سی لغو، بیہودہ بے معنی، فضول واہیات باتیں کرتے رہے۔

الفریڈ کو انگڑائیاں لیتے دیکھ کر لنیرا نے رخصت چاہی۔ الفریڈ نے اُسے اپنا پتا دیتے ہوئے اتر سوں دعوت پر مدعو کیا۔ جسے قدرے ردّ و قدح کے بعد لنیرا نے قبول کر لیا۔ الفریڈ گھر کی جانب چل دیا اور ایک بار پھر اُس کے پیٹ میں بل پڑ گئے کہ اُس نے پاسنگ شو کے متعلق کیوں نہ کچھ پوچھا۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اُس کے احساس نے اور زیادہ شدت اختیار کرلی۔ اُس نے سوچا مجھے ضرور پوچھنا چاہیئے تھا۔" اور جب وہ اپنے بنگلہ میں داخل ہُوا تو اُسے یقین آگیا کہ پاسنگ شو کے متعلق استفسار کرنا قطعاً معیوب تھا۔ "میں نے خواہ مخواہ دردِ سر مول لے لی۔ مُفت میں سر مغزن کیا۔ کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ کوئی مضائقہ نہیں تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہی اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب کے ملاقات میں وہ ضرور اتنا بتائے گا۔

لنیرا کو دیکھتے ہی اُس کا جوش یوں ٹھنڈا ہونے لگتا جیسے جھاگ بیٹھنے لگے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ اس کا جواب تو سائیکلوجسٹ ہی بہتر جانتے ہونگے بہر حال ایسا ہوتا تھا، ایسا ہُوا اور الفریڈ کا عزم صمیم، اٹل فیصلہ خس وخاشاک

کی طرح نازک سُرخ شفق ایسے گالوں کے سُرخ سمندر میں بہہ گیا۔ وہ پہلے کی طرح لنیرا سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مگر اُس کے چہرے پہ کچھ پریشانی سی کچھ خوف سا نمودار تھا۔ لنیرا ذہین تھی۔ اُسے اس طرح ملول اور غمزدہ دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ کیونکہ وہ یہ جانتی تھی کہ الفریڈ نے اُسے ایک غیر شخص کے ساتھ شراب پی کر ناچتے ہُوئے دیکھ لیا تھا لیکن وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ اُس نے بھی الفریڈ کو دیکھا تھا چنانچہ الفریڈ کو اُس نے یوں چکمہ میں ڈالنا چاہا۔ "میری سالگرہ کا دِن کتنا مبارک دِن تھا کہ مجھے تم ایسے انسان سے مُستفید ہونے کا موقع ملا۔" الفریڈ کے ہونٹوں پر منکسرانہ تبسّم نمودار ہُوا۔ لنیرا نے پھر کہا۔ "آپ کا تحفہ خُوب تھا۔ تحفہ کم از کم ایسا تو ہو جسے تحفہ کہا جا سکے۔ اس معاملے میں ہیزل کا بھائی تو بالکل بُدھو نکلا۔ وہ کار دیکھی تھی نا آپ نے وہ اُسی نے مجھے تحفتاً دی تھی۔

"بھلا یہ بھی کوئی تحفہ ہُوا؟ وہ سروں کو امیری دکھانے چلے تھے۔ میں نے کار واپس کر دی ہے۔" الفریڈ جو کرسی سے ٹیک لگائے تھا جلدی سے آگے کھسک کر گردن اکڑاتے ہُوئے بولا "کیوں؟" لنیرا نے آہستہ سے کہا جیسے دِیا بُجھ جائے "بس یونہی" اور پھر تیزی سے بولی۔ "آخر اتنا بڑا تحفہ کیوں لیا جائے؟" سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں نے اُسے برٹ انسٹی چیوٹ میں شراب کی دعوت دی تھی۔ دراصل میں کار واپس

کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے میں نے دعوت کا اہتمام کیا۔ مجھے کافی مجبور کرنا پڑا۔ مانتا ہی نہیں تھا کہہ رہا تھا "معمولی سی چیز ہے تم ایسے ہی اسے اتنی اہمیت دے رہی ہو۔" میرے بار بار اصرار کرنے پر مان تو گیا مگر کافی حد تک ناراض نظر آتا تھا۔" الفریڈ پھول کر کپّا ہوگیا۔ "سچ"۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔ لنیرا نے کہا۔ "تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں"۔ الفریڈ کے گال ناچنے لگے اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ جیسے گہرے اندھیرے میں جگنو، جیسے اماوس کی رات جنگلی بلی کی آنکھیں۔

اور پھر وہ برٹ النسٹی چیوٹ میں کم اور اس بوڑھے شیشم کے درخت کے نیچے زیادہ بیٹھنے لگے۔ یہاں بیٹھ کر انھوں نے محبت کا راگ الاپا۔ اور یہیں اس راگ میں لوچ اور میٹھا رس پیدا ہوا۔ اُن کے راگ کی شیرینی پھوٹ پھوٹ پڑتی سمپلسن نے جب دیکھا کہ محبت جوبن پہ ہے اور کھلتی ہوئی کلیاں پوری بہار دے رہی ہیں تو کچھ کوشش کے بعد اُس نے انہیں ایک پگڈنڈی پر لا کھڑا کیا۔ ساتھ ساتھ چلنا اُن کا اپنا کام تھا۔ سمپلسن اپنا حق ادا کر چکا۔ الفریڈ لنیرا کو اپنی منگیتر پا کر یوں محسوس کرنے لگا جیسے ستارے نوچ لایا ہے۔

جس طرح الفریڈ اور لنیرا بالکل قریب ہوگئے تھے۔ اسی طرح جنگ کا خطرہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر فولادی چیلیں جو بہت کم نظر آیا کرتی تھیں قطار اندر قطار منڈلانے لگیں۔ بار بار بلیک آؤٹ ہوتا رہتا ملٹری کی موٹریں اور دلیہ قامت

ٹینک اِدھر اُدھر گھومتے۔ گھنے درختوں میں اور ہیز کے پیچھے بڑے بڑے کالے مُنہ والی توپیں گاڑ دی گئیں۔ جگہ جگہ خندقیں بن گئیں اور لوگ ہراساں رہنے لگے۔ چہرے یوں جیسے ہلدی مَل دی ہے۔ اکثریت دشمن سے متنفر تھی۔ کوئی کہتا "سالے بڑے ہی سفلے ہیں"۔ بیچ سے کوئی بول اُٹھتا "کمینے مار کھا کر بھی پیچھے نہیں ہٹتے" "حرام خور یوں ہی ملیامیٹ ہو جائینگے" لیکن اندر ہی اندر اُنہیں یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں ہمارا ہی خاتمہ نہ کر دیں۔

اُن کے ہاتھوں کئی کورپانی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ "عروج زوال کی نشانی ہے"۔ "باقیوں کو بھی جہنم کی آگ میں دھونک دینا چاہیئے۔ وہ کسی بھی وقت وبالِ جان بن سکتے ہیں"۔ چنانچہ ایک سنسان رات جبکہ لوگ دُنیا مافیہا سے بےخبر پڑے تھے۔ بڑے بڑے عزم، بڑی بڑی حسرتیں لئے، یکایک فولادی چیلوں نے بم گرائے۔ بڑی بڑی عمارتوں کے پرخچے اُڑ گئے۔ گوشت کے لوتھڑے اُڑ اُڑ کر آسمان تک جا پہنچے۔ کسی کی ٹانگ اُڑ گئی، کسی کا سر غائب، کسی کا بھیجا آدھا اندر آدھا باہر، کہیں شیر خوار بچوں کے مرمریں خون کی چھچاہٹ، کہیں گرتے پڑتے لنگڑاتوں کی دلدوز چیخیں، سسکیاں رینگ رہی تھیں، چیخیں آسمان سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں اور کوئی سننے والا نہ تھا، بےزبان زخم خوردہ بچے ہزاروں لاکھوں ٹن مٹی کے نیچے اپنی شفیق ماؤں کے ذرا سی ٹیس سے بہہ جانے والے دل گرما رہے تھے اور "نشیں" "بیکسوں کی مچلتی ہوئی حسرتیں" سے گلی کوچے بھرے پڑے تھے۔ آنکھوں

کو جلانے والا دُھواں ہر سمت پھیلا ہُوا تھا۔ فاسفورس اور نائیٹریٹ کی تیز اور ناگوار قسم کی کڑواہٹ اور سڑی گلی نعشوں کی متعفن بدبُو سے دم گھٹا جا رہا تھا گلی جو بارونق شہر تھے آج صدیوں پُرانے کھنڈر معلوم ہو رہے تھے۔ اور سرمایہ مُسکرا رہا تھا۔ سرمایہ مسکرا رہا تھا۔

ایک امریکن فوجی بیہوشی کے عالم میں بڑبڑایا "ہم نے بھی پچھلے ہفتہ ایسے بم گرائے کہ سب کچھ ملیا میٹ کر دیا۔ جو دو چار بچ گئے ہونگے اُنکی ہڈیوں میں یہ زہریلی گیس گھس گئی ہو گی۔ یہ اتنی زہریلی ہے کہ صدیوں تک اس کے اثرات ختم نہیں ہو سکتے" دوسرا جس کے بازو کو گولی چیر کر نکل گئی تھی بڑی حسرت سے کہہ رہا تھا "وہ گوریائی لڑکی کتنی خوبصورت تھی۔ سُرخ گال گھنی پلکیں لانبے بال مدہوش ساتی چال"۔ وہ لڑکی اُسے یاد آ رہی تھی جسے وہ بالوں سے گھسیٹ کر لایا تھا۔ جس کے ماں باپ اور جوان بھائیوں کو سوتے میں اُس نے گولی کا نشانہ بنایا تھا اور جس سے جنسی بھوک مٹانے کے بعد اُس نے گولی مار دی تھی وہ چاہتا تھا کہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے مگر اُس کے ساتھیوں نے اُسے اجازت نہ دی تھی وہ خود ایسی کئی لڑکیوں کو اپنی تیز زہریلی سنگینوں پر چڑھا چکے تھے۔ جب اُن کی سنگینیں بچوں، بوڑھوں اور جوان لڑکیوں کی چھاتیوں میں بجلی کی سی تیزی سے گھس سکتی ہیں پھر یہ سنگین کیوں نہ اپنے جوہر دکھاتی۔

جھگڑا فساد ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہُوا ہے۔ فاتح کے لئے بھی اور

مفتوح کے لئے بھی۔ اسی نقصان کے باعث الفریڈ کو ایسے مکان میں رہنا پڑا جسے بمشکل ڈربہ کہا جا سکتا ہے صرف ایک کمرے پہ آدھی چھت لگی ہوئی تھی جس کے متعلق اُسے ہر وقت یہی اندیشہ رہتا تھا کہ اب نیچے آئی اب آئی۔ سب دروازے اور کھڑکیاں جل کر راکھ ہو گئی تھیں اُس نے وہاں ٹاٹ لگا دیا تھا مگر یہ ٹاٹ اس برفیلی سرد، یخ ہوا کو نہ روک سکتے تھے جو اُس کی ہڈیوں میں جا گھستی تھی۔ لینبرا اور اس کی ماں کو بھی اسی قسم کا ڈربہ ملا تھا۔

الفریڈ کی منگیتر الفریڈ کی نہ رہی، اُسے خریدنے والے کئی الفریڈ پیدا ہو گئے الفریڈ کچھ عرصہ تک تو کبھی کبھی خیریت پوچھنے جاتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ لینبرا اُس کی نہیں رہی تو اُن کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ لینبرا کی ماں اُسے بازار میں مل گئی۔ الفریڈ آنکھ چُرا کر چُپکے سے اُس کے پاس سے گذر گیا۔ اُسی شام لینبرا کی ماں اُس کے پاس آئی اور بغیر سلام کئے ڈوبی آواز میں کہنے لگی۔ "بیٹا الفریڈ میرا تو کوئی نہیں ہیں نہ بھی کھاؤں جب بھی گزارہ کر لونگی مگر یہ چھوٹے چھوٹے بچے، انہیں بھوک سے تڑپتے اور کلبلاتے مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ کیسے صبر کر سکتے ہیں بیٹا؟ حالات کا اندازہ لگانا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اُن کے لئے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ بیٹا تم خود سمجھدار ہو" اور وہ ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگی۔

بڑھیا باتیں کرتی جا رہی تھی اور الفریڈ کا جی چاہتا تھا کہ ہر لفظ پہ جلی ہوئی

سینکڑوں اینٹیں اُٹھا کر اُس کے سر پہ مارے چلا جائے۔ بڑھیا نے اپنی آنکھیں "کجلائی ہُوئی چنگاریاں" ادھ جلی کھڑکی پہ گاڑے پھر کہا۔

"تمہارا بھی تو کوئی سلسلہ نہیں بن رہا۔"

الفریڈ سوچنے لگا "سلسلہ"؟ سارا سلسلہ تو سرمایہ داروں کے ہاتھ ہے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں پندرہ کروڑ انسانوں کو بے گھر کر دیا اور ساڑھے سات کروڑ جانیں یوں چٹکیوں میں گنوا دیں جن کا کسی کو احساس تو خیر دُور کی بات ہے یاد تک نہیں۔ ان پاسنگ شو کے بیٹوں نے کئی کروڑ روپیہ ایٹمی ہتھیاروں پر خرچ کیا۔ کیا اتنا روپیہ تعلیمی درسگاہوں، ہسپتالوں اور انڈسٹریز کے لئے خرچ کر کے دُنیا کو نمونۂ فردوس نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ ان حرامخوروں نے پہلی انڈسٹری بھی تباہ و برباد کر دی۔ کیا میرے جیسے کئی الفریڈ کوریا میں برباد نہیں ہُوئے؟ کیا لاکھوں لینیرائیں اقتصادی بد حالی سے مجبور ہو کر اپنی عصمت فروخت نہیں کر رہیں؟

آج وہ اس شیشم کے نیچے کھڑا سوچ رہا تھا۔ یہ پاسنگ شو کے بیٹے سرمایہ داری کے پتلے تیسری عالمگیر جنگ برپا کرنے پر تُلے ہُوئے ہیں۔ اُن کو کروڑوں انسانوں کی جانیں، بے بس جوانیاں، معصوم بچے اور بوڑھی ناچار عورتوں کو برباد کر کے بھی شرم نہیں آئی ییبول، ناگاساکی اور ہیروشیما جیسے شہروں پر ایٹم بم گرانے کے بعد بھی یہ لوگ گردنیں اکڑا کر شانِ فرعونیت سے چلتے ہیں۔ اب بھی یہ کوڑھ دماغ ہمیں ایسی ہی تباہی کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ کیا ہم ایک بار پھر تباہ ہوں گے؟

ابھی تو پہلی یادیں، پہلی سسکیاں ہماری رگوں میں دوڑ رہی ہیں۔ کیا ابھی ہم میں اتنی قوت ہے کہ ایسے ہیبتناک اور ڈراؤنے ماحول کو برداشت کر سکیں یا اس کا مقابلہ کر سکیں؟ نہیں نہیں ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے۔ اب ہم اپنے ان امن کے پیاسے ہونٹوں پہ ہرگز ہرگز تعزیریں نہیں ڈالنے دیں گے!

وہ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک اُس نے محسوس کیا رات کافی گزر چکی ہے۔ سردی سے اُس کے کانوں کی لوئیں نیلی ہو رہی تھیں اور ناک کی چونٹی سُرخ ہو گئی تھی۔ وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ سوکھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے درشت لہجے میں کہا۔ ٹھیرو! بھاگے تو گولی سے اُڑا دونگا" اور پھر قریب آکر اُس نے ٹارچ جلا کر الفریڈ کا چہرہ دیکھا۔ "تم کون ہو؟" ایک ایسا مسافر جس کو اپنی منزل کے نشان تک کا پتہ نہ ہو۔" پولیس افسر ناک سکوڑ کر کہنے لگا "تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔" اس نے دوبارہ سوال کیا۔ "اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس کا جواب تو اس کے اپنے پاس بھی نہیں تھا پولیس افسر نے منہ گول بناتے ہوئے سیٹی بجائی۔ دو سپاہی بھاگتے ہوئے آئے اُسی لمحہ ابرِ باراں کی طرح شیشم کے پتے آنسوؤں کی صورت گرے۔

صبح جلی حروف میں اخباروں میں چھپ گیا:۔

"برانس پل کو تباہ کرنے کی سازش"

"ایک پُراسرار کمیونسٹ کی گرفتاری"

"اس کے ساتھی ڈائنامیٹ کا کیس لے کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے"

اُسے کئی بار ٹارچر کیا گیا مگر وہ اس سے زیادہ اور کچھ تسلیم نہ کر سکا کہ وہ سوویت کے مشہور ادیب ایلیا اہرن برگ کے جوابات کو صحیح سمجھتا ہے۔ رابرٹ ڈی پوٹر امریکی ماہر طبیعات کی کتاب "جوہری انقلاب" میں جوہری قوتوں کے خلاف جو نقشہ کھینچا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور مارکس، لینن، اینگلز اور اسٹالن کے نظریات سے واقف ہے۔ اس کے عوض الفریڈ کو چودہ سال قید با مشقت سزا دی گئی اور پولیس افسر کا ایک پھول بڑھ گیا۔ اس کے سارے پھول یوں ہی بڑھے تھے وہ سپاہی بھرتی ہوا تھا۔ اگر وہ اس قدر ہوشیار نہ ہوتا تو شاید آج بھی سپاہی ہی ہوتا۔ اُس نے ایسے ہی کئی جعلی کیس بنا کر کئی عہدے حاصل کئے تھے۔

جیل کا داروغہ الفریڈ کو دیکھ کر جل ہی تو جاتا اور اُس کے ساتھ بڑی کج روی سے پیش آتا۔ وہ اپنی موٹی پلپلی توند پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا "ہماری گورنمنٹ کتنی بیوقوف ہے۔ میں منسٹر ہوتا تو سب سے پہلے مارکس، لینن، اینگلز اور اسٹالن کی کتابیں جلا کر راکھ کرتا۔ یہ کمبخت ڈائنامائٹ ہی تو ہیں۔ ہماری گورنمنٹ اتنی بیوقوف ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نہیں سمجھتی۔ اور یہ سالے کیمونسٹ؟ اُس کا ہاتھ پلپلی توند پہ اور زور سے پھرنے لگتا۔" ان سالوں کو تو ایکدم اڑا دینا چاہیئے۔ یہ تو ڈائنامائٹ ہی تو ہیں۔ گورنمنٹ کو تباہ کرنے میں ڈائنامائٹ سے بھی زیادہ تباہ کن" اور پھر سارا غصہ دانت پیس کر الفریڈ پر نکالتا۔

لینیرا کو الفریڈ سے اب بھی کافی ہمدردی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اقتصادی بدحالی نے اُسے اپنی عصمت فروخت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بھی مارکس پڑھا تھا۔ جب لوگ بے بس ہو جاتے ہیں تو ان کو مارکس پڑھنے کا شوق چرّاتا ہے۔ کاش پہلے ہی سے لوگ ان مکروہات کو جان لیں۔ لینیرا نے اپنا دھندا اور تیزی سے چلانا شروع کر دیا۔ سرمایہ دار اس کے پاس آتے تھے اور وہ سرمایہ داری کو یوں ختم کرنا چاہتی تھی۔ اب اس کی وہ پہلی سی رنگت نہ رہی تھی۔ اس کے گالوں کے گڑھے جو الفریڈ کے لئے جان لیوا ثابت ہوئے تھے اب عنقا تھے اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ وہ جاں بلب معلوم ہو رہی تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی "کیا اس طرح سرمایہ ختم کیا جا سکتا ہے؟ مگر فوراً ہی یہ کہتے ہوئے اس واہیات سوال کو وہ دل سے نکال دیتی کہ "اُسے ایسی فضول باتیں کبھی نہیں سوچنا چاہئیں"۔

ریڈیائی ڈرامہ

ایک گیت ــــــ ایک شعلہ

افراد

محسن عقیل	بائیس سال کا نوجوان قاسم کا جگری دوست۔
گلناز	سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی قاسم کی بیوی۔
احمد	پچیس سال کا نوجوان گلناز کا بھائی۔
زینب	پینتالیس سال کی اُدھیڑ عمر عورت گلناز کی ماں۔
ثریا	گلناز کی چھوٹی بہن عمر تقریباً گیارہ سال۔
افتخار	تیرہ سال کا لڑکا گلناز کا چھوٹا بھائی۔

(ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے کبھی کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا
گلناز کی زلفوں کو بکھیر کر اُس کے گالوں پر گرا دیتا ہے۔ وُہ
اپنی پرانی قمیص کو چھوٹا کر رہی ہے تاکہ بدن کے ساتھ
بالکل چپک جائے۔ ثریا باہر صحن میں آٹا گوندھ رہی ہے
اور افتخار برآمدے میں کھڑا باہر دیکھ رہا ہے۔ اچانک اُسے کچھ یاد آجاتا ہے)

افتخار۔ باجی! (اُسے مصروف دیکھ کر) اوہو تمہاری قمیص ہی ٹھیک ہونے
میں نہیں آتی۔ ذرا بھاگ کے آئیو باجی۔ میری اچھی باجی! بس یہاں اسی جگہ
کھڑی رہیو، حمیدہ آئیں تو اُنہیں روک لینا۔ ابھی وہ اِدھر سے گزریں گے
میں ابھی آیا (چٹکی بجاتا ہے) بس دو منٹ میں۔

(گلناز کی بات سُننے سے پہلے ہی بھاگ جاتا ہے۔ دو چار
قدم تیزی سے بھاگتا ہے کہ محسن عقیل نظر آجاتے ہیں۔ پھرتی
سے واپس آتے ہُوئے)

افتخار۔ (خوشی سے چیختا ہے) باجی بھیا آئے۔

(ثریا محسن کو دیکھ کر آٹے سے لتھڑے ہُوئے ہاتھ چھپاتے
ہُوئے اندر بھاگ جاتی ہے)۔

گلناز۔ ارے سؤر کی طرح چیختا کیوں ہے؟ بھیا تو روز ہی آتے ہیں۔ (ثریا
سے) اری تو کیوں بھاگے جارہی ہے؟

محسن عقیل (اندر داخل ہوتے ہوئے) ننھی منی سرکار کی خدمت میں سلام عرض کیا جا سکتا ہے؟ (ایک لمحہ بعد) یہ جناب کے چہرہ مبارک پہ تکدر کے آثار کیسے ہیں؟ بھابی تم میں تو وہ دم خم ہی نہیں رہا۔ ارے تمہارے چہرے پر یہ حقارت کی لکیریں کیوں بننا شروع ہو گئیں؟

گلناز۔ (دھیمی اور مردہ آواز میں) اوہ آپ؟ میں سمجھی احمد بھیا آئے ہیں۔ (جیسے کوئی ناامید ہو چکا ہو) یہ لکیریں تو بنتی مٹتی ہی رہتی ہیں۔

محسن عقیل۔ (اُس کے ہاتھ میں قمیص اور سوئی دھاگا دیکھ کر) بھابی! بس تم ایک اسی بری عادت کی شکار ہو۔ اور تو تم ساری کی ساری سر سے پاؤں تک بہت ہی اچھی ہو (مسکراتے ہوئے) تمہاری ان بکھری ہوئی زلفوں کی قسم، بالکل سچ کہتا ہوں (وقفہ) آخر تم ان قمیصوں سے کیا چاہتی ہو؟ کھلی قمیصیں بہت اچھی ہوتی ہیں بھابی! ان میں نئے پرانے سب عیب چھپ جاتے ہیں۔

گلناز۔ تشریف تو رکھیے پھر لیکچر دے لیجیئےگا۔ (ثریا سے) اری اندر کیا کر رہی ہے؟ جلدی سے اُجلی چادر لا کر اس چارپائی پہ بچھا دے۔ یہ تو بہت گندی ہو گئی ہے۔

محسن عقیل۔ رہنے دو بھئی یہی ٹھیک ہے (بیٹھ جاتا ہے) وہ بھی خراب ہو جائیگی۔ یہ چادریں کمبخت باہر نکلتے ہی میلی ہو جاتی ہیں۔ ذرا سی دیر میں

ان کی ساری تھر تھری غائب ہو جاتی ہے۔ ان کو صندوقوں ہی میں بند رہنا چاہیئے۔ وہی جگہ ان کے لئے موزوں ہے۔ کیسی خوبصورت دکھتی ہیں ہاں یہ؟

گلناز۔ مجھے آپ سے اختلاف ہے، چادروں کی جگہ صندوق نہیں چارپائی ہے (چارپائی پر نئی چادر کا کچھ حصہ پھیلاتے ہوئے) دیکھیئے یہ ندی کنارے ریت کا سا رنگ کیسا نکھرا نظر آتا ہے۔

محسن عقیل۔ مگر اس کی یہ شان بہت دیر قائم نہ رہ سکے گی۔ جلد ہی اسمیں شکنیں پڑ جائیں گی۔ ساری ملاحیت، دلفریبی اور کشش جاتی رہے گی۔ اور تم اس سے نفرت کرنے لگو گی۔

گلناز۔ چلیئے چھوڑیئے اس قصّے کو! آپ کو تو بس اُلجھنا ہی آتا ہے۔ کبھی دوسرے کے کہنے پر بھی چل کر دیکھ لینا چاہیئے۔

افتخار۔ (ثریّا سے) مجھے جلدی سے ایک ٹکیا پکا دو۔ میں تو آج بھیا کے ساتھ فلم دیکھنے جاؤنگا۔ بہت دنوں کے بعد قابو آئے ہیں۔

محسن عقیل۔ جب کوئی جواب بن نہیں پڑا تو مجھے یوں دھونس دینے لگی ہو۔ اچھا پھر—— خیر چھوڑو اس قصّے کو (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) ارے بی بی کدھر ہیں؟

ثریّا۔ وہ ذرا..........

محسن عقیل۔ کسی بہن دہن کے گھر گئی ہونگی۔ اُدں۔ اللہ جانے ان کی کتنی بہنیں

ہیں۔ اُن کو کہنا ان سب کو بھرتی کروادیں (کھڑا ہو جاتا ہے) اچھا اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے ایک جگہ جانا ہے۔

افتخار۔ چھیو تو ابھی یہیں کھڑی ہے۔ کہا تھا نا ایک ٹکیا لپا دو۔ تیری چٹیا کاٹ دُونگا۔ جبھی تو ٹھیک ہو گی۔

ثریا۔ ہوں بڑا آیا چٹیا کاٹنے والا۔ میں تمہارے سارے پتنگ پھاڑ دُونگی کنکوے کہیں کے تو نے سمجھا کیا ہے مجھے؟

افتخار۔ تجھے بتاتا ہوں کنکوا کسے کہتے ہیں۔ آئندہ میری پتنگوں کا نام لیا تو گدی سے زبان کھینچ لونگا۔ اور اب تو اپنی گڑیا کو سنبھال کے رکھیو۔ کانی نہ کردی تو مجھے افتخار نہ کہنا۔ لومڑی سی کیسے بڑھ چڑھ کر باتیں بناتی ہے۔

گلناز۔ آپ جب بھی آتے ہیں طوفان کی طرح اور آندھی کی طرح چل دیتے ہیں۔ ہر دفعہ آپ ضروری کام کا بہانہ بنا کر کھسک جاتے ہیں آخر یہ ضروری کام کونسے ہیں؟ ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے۔ (طنزاً) بعض لوگ جانے کیوں اپنے آپ کو اتنا مصروف ظاہر کرتے ہیں۔

افتخار۔ بھیا تو نری ہوائی ہیں۔ ہوائی کو ذرا آگ دکھائیے ابھی یہاں ابھی آسمان پر۔ مگر بھیا آپ ایسی ہوائی ہیں جو بغیر آگ ہی کے......

گلناز۔ چپ شریر کہیں کا۔ بڑوں کو یوں کہا جاتا ہے (محسن عقیل سے) آپ کے لاڈ پیار نے ہی اتنا سر چڑھا دیا ہے۔

محسن عقیل (سرگوشیانہ لہجے میں) بھابی تم آگ ہی تو ہو اگر تم قاسم لالہ کی بیوی نہ ہوتیں تو خدا کی قسم میں تم سے شادی کرتا۔

گلناز۔ (شرماتے ہوئے) آپ بڑے وہ ہیں۔

محسن عقیل۔ بھابی وہ تو نہیں ہیں تو بس کچھ ہوں جو تمہارے سامنے ہوں۔ بیٹھ تو وہی ہیں ہم بھلا بڑے وہ کب ہو سکتے ہیں۔ شرارت آمیز لہجے میں کاش ہم چھوٹے وہ ہی ہوتے۔

گلناز۔ (بڑے ہمدردانہ لہجے میں) دیکھئے سب کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ لاؤ سکھا دوں (بارش تیز ہو جاتی ہے) بارش تو پہلے سے بھی تیز ہو گئی ہے۔ ایسے موسم میں بھلا کہاں جاؤ گے!

محسن عقیل۔ (دھیمے سے اپنے آپ سے) فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں (گلناز سے) ہاں! اسی لئے ہی چاہتا ہوں جلد چلا جاؤں۔ پھر تمہارا بھی کیا اعتبار سکھانے کی بجائے اور بھگو دو۔ (دفعۃً) دراصل ہمیں گھر دل ہی میں بیٹھنا چاہیئے۔

گلناز۔ کیا مطلب۔

محسن عقیل۔ باہر گھومنے والے انسان کہاں تک بچ سکتے ہیں کبھی نہ کبھی بھیگ ہی جاتے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو بے حد احتیاط برتا کرتا ہوں مگر پھر بھی بھیگ ہی گیا۔

گلناز۔ مجھے تو آپ کی باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔

محسن عقیل۔ کیوں؟ کوئی اطالوی زبان بول رہا ہوں۔

گلناز۔ (بات کاٹتے ہوئے لجاجت سے) بیٹھ جائیے نا! کب تک کھڑے رہیئے گا۔

محسن عقیل۔ ہاں کب تک کھڑا رہ سکوں گا۔ کبھی کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں۔

نہیں بیٹھنا چاہتے انہیں بھی کبھی نہ کبھی ضرور بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ اُٹھنا بیٹھنا بھی عجیب کھیل ہے بھابی۔

گلناز۔ (ہنستی ہے) کبھی کبھی آپ بڑی مزے کی باتیں سناتے ہیں۔ چائے تو پیجئے گا نا؟ سردی بڑھ رہی ہے۔

محسن عقیل۔ (طنزاً) بہت جلد خیال آ گیا آپ کو!! شکریہ۔

گلناز۔ چلو دیر ہی سے سہی۔ خیال تو آ گیا نا۔ آپکی طرح بالکل بھول تو نہیں گئی۔

محسن عقیل۔ جناب کا اشارہ کس طرف ہے؟ میں سمجھا نہیں۔

گلناز۔ جی بہت اچھا۔ نہیں سمجھ میں آتا تو صاف کہے دیتی ہوں۔ وہ وعدے یاد دِلا رہی ہوں جو ایفا نہ ہو سکے یا جان بُوجھ کر کئے ہی نہ گئے۔

محسن عقیل۔ (انکساری سے) اوہ۔ آپ ....

گلناز۔ کئی خط لکھے (طنزاً) جواب دینے کی زحمت کون گوارہ کرتا۔ یہ محبت وحبت سب سُلانے کی باتیں ہوتی ہیں۔ سچ مچ آپ تو بہت ہی کھورے نکلے۔ آپ کے بھائی صاحب اتنا یاد کرتے رہے۔ کہہ رہے تھے۔ "اب میں اُس سے کبھی نہیں مِلوں گا۔ بہت کورا ہو گیا ہے۔ پُخند کہیں کا۔"

محسن عقیل۔ (حیرانگی سے) مگر بھابی وہ تو سب کچھ جانتے ہیں۔

گلناز۔ کیا؟

محسن عقیل۔ یہ ایک بات۔

گلناز۔ مجھے بتانے والی نہیں۔ (وقفہ) میں جانتی ہوں۔ آپکی ہنگیتر رہتی ہے نا وہاں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں آپ مجھ سے کیا چھپاتے ہیں۔

محسن عقیل۔ نہیں بھابی تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔

گلناز۔ تو یہ بات نہیں ہے کوئی اور ہے؟ پھر تو میں ضرور پوچھوں گی۔

محسن عقیل۔ وہاں جاتے ہی میں بے حد اداس ہو جاتا ہوں اور شاید بیمار سا بھی۔

گلناز۔ آخر کیوں؟

محسن عقیل۔ چھوڑو اس قصّے کو۔ تم پوچھ کر کیا کرو گی؟

گلناز۔ میں تو چھوڑنے کی نہیں۔ پوچھے بغیر تو ٹلوں گی نہیں۔ آخر آپ مجھ سے چھپاتے کیوں ہیں؟

محسن عقیل۔ تو سنو ——— وہاں ایک لڑکی رہتی تھی جس سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔ ہم وہاں سے چلے آئے اس لیئے میری کہانی ادھوری رہ گئی۔ بس یہی ہے سارا قصّہ

گلناز۔ کون تھی وہ؟ اب کہاں ہے وہ؟

محسن عقیل۔ وہ ایک ڈاکٹر کی لڑکی تھی جو ہندو تھا۔ اب جانے وہ لوگ کہاں گئے ہیں جیتے ہیں یا مر گئے ہیں۔

گلناز۔ لغو۔ بالکل لغو۔ ہندو لڑکی سے محبت؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر وہ یہاں بھی رہتے تو آپ کیا کر لیتے؟

محسن عقیل۔ محبت ذات پات مذہب کچھ نہیں دیکھتی۔ (وقفہ) (دھیمی آواز میں) ہاں میں کیا کر لیتا۔

گلناز۔ کب کی بات ہے یہ؟

محسن عقیل۔ تقسیم سے بہت پہلے کی۔ اُس وقت میں بچّہ ہی تھا محبت کے فلسفے سے بالکل ناآشنا۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ وہ مجھے بے حد پیاری لگتی تھی اور میں اُسے بے انتہا چاہتا تھا لیکن ہم دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ بات نہ کر سکے۔

گلناز۔ آپ نے کوشش تو کی ہوگی؟

محسن عقیل۔ ہاں۔ کیوں نہ کرتا۔ ایک دفعہ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُسے خط لکھا۔ یہ مشورہ قاسم لالہ ہی نے دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی باتیں کہاں آسکتی تھیں۔

گلناز۔ پھر؟

محسن عقیل۔ وہ لالے نے ایک بھٹیارن کو دے دیا جو ان کے مکان کے بالکل سامنے چنے اور مکئی بھونا کرتی تھی اور ایک چونّی اُس کی ہتھیلی میں تھماتے ہوئے قاسم لالے نے کہا "یہ خط حامی کو دے دینا"

گلناز۔ حامی کون؟

محسن عقیل۔ اُسی لڑکی کا نام ہے۔

گلناز۔ پھر اُس نے کیا جواب دیا؟

محسن عقیل۔ (لمبی ٹھنڈی سانس لیتا ہے) جواب ؟ اُس نے خط کو دیکھے بغیر اُسی بھٹی میں جھونک دیا اور بھٹیارن سے کہنے لگی اگر آئندہ ایسا کام کیا تو ماتا جی کو بتا دُونگی۔

گُلنازہ۔ اس کے بعد کیا ہُوا ؟

محسن عقیل۔ میں قاسم لالے کی دُکان میں بیٹھ کر جی بھر کر رویا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ ہوگئیں۔ لالہ نے مجھے چُپ کرانے کی بہت کوشش کی مگر جب اُس کی کوشش کارگر نہ ہُوئی تو اُس نے مجھے ایک اور ترکیب بتائی۔

گُلنازہ۔ وہ کیا ؟

محسن عقیل۔ اُنہی دنوں ساتھ کے گاؤں میں اُس کے ایک دوست کا بڑا بھائی چھٹی پہ آیا تھا۔ غالباً کپتان تھا۔ لالہ اُس کا کیمرہ مانگ لایا۔ اور کہنے لگا۔ "تو اس کا فوٹو کھینچ لو۔" میں نے کہا تم خود کیوں نہیں کھینچتے۔ کہنے لگا نہ بابا کہیں خراب ہوگئی تو خواہ مخواہ میرے گلے پڑے گے۔ اُس نے تصویر لینے کا طریقہ بتا دیا مجبوراً خود ہی کھینچنا پڑی۔

افتخار۔ واہ وا بھیا تو آپ کو تصویر لینا بھی آتا ہے۔ ایک تصویر ذرا ہماری بھی ہو جائے (ثریا سے) کیوں چھیو تم بھی تصویر اُترواؤ گی نا ؟

ثریا۔ ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ تم کوئی بہت لاڈلے ہو (محسن عقیل سے) ہاں بھیا اب کی آئے تو کیمرہ ضرور لیتے آنا۔

افتخار۔ میرے ساتھ اُلٹی سیدھی نہ چلایا کرو۔ یاد رکھو گڑیا کانی کر دونگا۔

محسن عقیل۔ بھئی وہ کیمرہ تو کسی کا تھا۔

گلناز۔ (پہلی بات کو جاری رکھتے ہوئے) پھر تصویر ٹھیک آگئی؟

محسن عقیل۔ آئی مگر دھندلی سی، وہ بھی اُن کے مکان کی۔ اُس کا یہ میں پتا ہی نہ چلا حالانکہ وہ دیوار سے ٹیک لگائے عین سامنے کھڑی تھی۔

گلناز۔ وہ آپ کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی؟

محسن عقیل۔ میں نے اُسے پتا ہی کب چلنے دیا تھا۔ چند لمحوں میں سب کچھ ہو گیا۔

گلناز۔ اُس کے بعد کوئی قدم نہ اُٹھایا؟

محسن عقیل۔ (دبے دبے لہجے میں) اور رونی صورت بنا کر) میں نے تو نہیں میرے باپ نے ایک قدم اُٹھایا۔ وہ یہ کہ ہم سب کو ساتھ لیکر لاہور آ ڈیرا جمایا۔

گلناز۔ اس کے بعد پھر کبھی کسی سے محبت نہ ہوئی؟

محسن عقیل۔ ہوئی۔ ہوئی کیوں نہیں۔

گلناز۔ وہ کون تھی؟

محسن عقیل۔ باجی کی ایک سہیلی تھی۔ بہت ہی خوبصورت۔ کندن کی طرح دمکتی۔ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں چاند ایسا طباق سا گورا گورا مکھڑا۔ مجھ سے آٹھ دس سال بڑی تھی۔ جب وہ گہرے نسواری رنگ کا ریشمی سوٹ پہنا کرتی تو مجھے بہت ہی پیاری لگتی۔ مجھے گہرا نسواری رنگ بہت پسند ہے۔ گورے رنگ پر بے حد بھلا معلوم دیتا ہے۔

گلناز۔ آپ کی محبت بھی آپ کی باتوں کی طرح عجیب ہے

محسن عقیل۔ (اُس کی بات پر کان نہ دھرتے ہوئے) ایک دن مجھے جانے کیا ہُوا میں نے باجی سے کہا کہ اپنی سہیلی سے کہہ دے ہمیشہ یہی گہرا سواری سوٹ پہنا کرے۔

گلناز۔ یہ کہتے ہُوئے آپ کو خوف نہ آیا؟

محسن عقیل۔ (اپنے ہی خیال میں) باجی نے اپنی سہیلی کو بتا دیا کہ میں نے ایسا کہا ہے اور اس کے بعد وہ جب بھی ہمارے گھر آتی اُسی سوٹ میں ملبوس۔ وہ مجھے گود میں بٹھا کر خوب پیار کیا کرتی۔

گلناز۔ کیا آپ بالکل چھوٹے تھے؟

محسن عقیل۔ نہیں ـــــ بس اس افتخار کی طرح ہونگا۔ (وقفہ) پھر اس کی شادی ہو گئی۔ کوئی مِلٹری کا حوالدار جمعدار جانے کیا دار تھا

گلناز۔ اور کسی سے بھی محبت ہوئی ہو گی (طنزاً) کسی ساٹھ ستر سالہ بُوڑھی کے ساتھ۔ یہی ایک قسم باقی رہ گئی ہے۔

محسن عقیل۔ بھابی مجھے یوں نہ دق کرو۔ تمہاری قسم مجھ پر ایسی باتیں بے حد شاق گزرتی ہیں

افتخار۔ بھیا وہ، دیکھو باہر سڑک کے اس پار۔ وہ سامنے کوٹھی ہے نا؟ وہاں ایک لڑکی رہتی ہے۔ بازو میں تھیلا لٹکائے جب سکول جاتی ہے مجھے بڑی پیاری لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے اُٹھا کر گھر لے آؤں۔

محسن عقیل۔ لے آئے ہوتے۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی۔

گلناز۔ اچھی باتیں سکھاتے ہیں آپ۔

محسن عقیل۔ اس میں بُرا کیا ہے؟ بچوں کا حوصلہ بڑھانا ہی چاہیئے ورنہ میری طرح ڈرپوک رہ جائیگا۔

گلناز۔ (بات کاٹتے ہوئے) اچھا پھر آپ نے کس سے محبت کی؟

محسن عقیل۔ اس کے بعد میں نے محبت کے جھمیلوں میں اُلجھنے سے ہمیشہ گریز کیا مگر پھر بھی بچ نہ سکا۔

گلناز۔ کس کے حُسن کے طوفان کی زد میں آگئے میرے یہ بھولے بھالے پنچھی۔

محسن عقیل۔ ایک ایسی پری کے جس کے رُخسار جیسے شعلوں کی لپکتی ہوئی لال لال زبانیں جس کی آنکھیں جیسے مسرتوں کا گہوارہ۔ انہی رخساروں انہی آنکھوں کی کشش نے مجھے بے دست و پا کر دیا۔

گلناز۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟

محسن عقیل۔ قاسم لالہ کی بیوی اور میری بھابی

گلناز۔ (شرماتے ہوئے) ہٹو یہ سب یوں ہی کہتے ہیں۔

محسن عقیل۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کوئی غلط بات کو بھی ٹھیک سمجھ لیتا ہے۔ اور کوئی صحیح کو بھی غلط۔

گلناز۔ چلیے چھوڑیئے اس قصے کو۔ مجھ کو بتاتے ہیں۔ (وقفہ) سردی کافی ہوگئی

ہے۔ تھوڑی سی گرم گرم چائے پی لیجئے۔

محسن عقیل۔ چائے ـــــ سردی ـــــ سردی اور چائے کا بھی خوب جوڑ ہے اچھے لفظ ہیں دونوں کتنی گھلاوٹ ہے ان دو لفظوں کے ملاپ میں۔

زینب (باہر ہی سے) اری تم دونوں اندر کیا کر رہی ہو۔ تمہیں پتا نہیں، شام ہو چلی ہے۔ ابھی تک ہنڈیا بھی نہیں دھر سکیں۔ آجکل کی لڑکیوں کو جانے کیا ہے، کام سے یوں جی چراتی ہیں..........

ثریا۔ (باہر آتے ہوئے) گوشت تو آپ اب لا رہی ہیں۔ کیا خالی ہنڈیا چولھے پر رکھ چھوڑتی۔ (آہستہ سے) اندر بھیا آئے ہیں۔

زینب۔ (اس سے بھی آہستہ آواز میں) کون بھیا؟

ثریا۔ قاسم بھائی کے..........

زینب۔ اوہ۔ اچھا۔ اچھا۔ کب سے آئے ہیں؟ چائے بھی پوچھی تھی یا نہیں؟

ثریا۔ پوچھی تو تھی۔ مگر ابھی تک ٹال مٹول ہی کر رہے ہیں۔

زینب۔ اس کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ تم بھی عجیب لڑکیاں ہو۔ اتنی دیر سے اسے یونہی بٹھائے رکھا۔

(اندر داخل ہوتی ہے)

پتہ چل گیا ہوگا کہ نانی آئی ہوئی ہے تبھی آئے ہو گے؟ قاسم نے خط لکھا ہوگا؟ تم بھی بالکل قاسم ہی نکلے میں تو سمجھتی..........

محسن عقیل۔ نہیں بی بی یہ بات نہیں۔ اصل میں ہوا یوں کہ.........

زینب۔ بس بھئی رہنے دو۔ میں تمہارے یہ تریا چلتر خوب سمجھتی ہوں۔ ان صفائیوں سے یہاں نہیں کام چلنے کا۔

محسن عقیل۔ آپ تو یونہی بدظن ہو رہی ہیں۔

زینب۔ (مونڈھے پر براجمان ہوتے ہوئے) اپنے لالہ سے بھی کبھی ملے ہو یا نہیں ؟

محسن عقیل۔ دیر ہی ہو گئی ہے۔

زینب۔ اچھا کیا نہیں ملے۔ ایسوں سے نہیں ملنا چاہیئے۔

محسن عقیل۔ نہیں بی بی ایسا نہ کہو۔ اُس جیسا کون ہو گا۔

زینب۔ تمہارے لیئے ہو گا۔

محسن عقیل۔ ہاں میرے لیئے تو ہے ہی مگر دُوسروں کے لئے بھی بُرا نہیں۔

گلناز۔ بی بی یہ تو ایسے ہی کہیں گے۔ ان کا دوست جو ہوا۔ میں نے تو ایسا کٹھور دل کبھی نہیں دیکھا۔ جب سے شادی ہوئی ہے۔ آج تک ایک بھی شئے نہیں بنا کے دی مجھے۔ پہلے بنے ہوئے کپڑے بھی ایک ایک کر کے سب پھٹ چکے ہیں مگر اُسے کچھ خیال ہی نہیں۔ کچھ کہو تو الٹا سڑی بساندی باتیں سناتا ہے۔

محسن عقیل۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میری رائے سے متفق نہیں ہو۔ ہوں ؟

گلناز۔ بالکل۔

محسن عقیل۔ آخر کیوں ؟

زینب ۔ تمہارے لئے اتنا اچھا کیوں ہے ؟

محسن عقیل ۔ بی بی میرا تو سب کچھ وہی ہے ۔ یہاں اچھے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اُسی کے دم قدم سے تو میں ہمیشہ زندگی میں زمانے سے ایک قدم آگے رہا ہوں۔

زینب ۔ تم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو ؟

محسن عقیل ۔ یہ تو شاید ٹھیک سے میں نہ بتا سکونگا۔ ہاں دھونکنی کا چکّر چلانا میں
نے اُسی سے سیکھا تھا۔

زینب ۔ (حیرانگی سے) تم اس کی دکان پر بھی بیٹھا کرتے تھے ؟

محسن عقیل ۔ ہاں ۔ کیوں ؟ اس میں کیا حرج تھا ؟

زینب ۔ تمہیں کوئی منع نہ کرتا تھا ؟

محسن عقیل ۔ منع ؟ مجھے تو کئی دفعہ پیٹا بھی گیا تھا کہ وہ ایک مزدور چھوکرا سارا دن
لوہا کوٹنے والا اور میں اچھے خاصے رئیس کا بچّہ ۔ وہ عمر میں بھی مجھ سے کچھ
بڑا اور میں چھوٹا ۔ آخر تنگ آکر انہوں نے مجھے کہنا ہی چھوڑ دیا ۔ جب پھر بھی
میں باز نہ آیا تو سب نے مجھ سے قطع کلام کر لیا ۔ مگر میں اُسے نہ چھوڑ سکا۔
بھٹی کا چکّر چلانے میں بھی ایک عجیب مزا ہے بی بی ۔

زینب ۔ تمہیں اتنا عزیز تھا ، آخر وہ تمہیں کیا سکھاتا تھا۔

محسن عقیل ۔ میں نے کہا نا بی بی سب کچھ میں نے اُسی سے سیکھا ہے ۔ تالیاں
تک تو بنانا میں نے اُسی سے سیکھیں۔

زینب۔ (ہنستے ہوئے) تم نے کونسا تالیوں کی دکان کرنا تھی؟ ہوں! اچھا یہ بتاؤ پرانی تالیاں بھی ٹھیک کر لیتے ہو؟

محسن عقیل۔ ہاں۔ کیوں؟

زینب۔ میری بھی ایک تالی ٹھیک کر دو۔ بہت دیر سے خراب پڑی ہے۔ زنگ تک تو لگ گیا ہے اس میں۔

محسن عقیل۔ بی بی وہ تالی میں نے دیکھی ہے۔ بہت گھسی ہوئی ہے۔ تم اُس سے ضرورت سے زیادہ کام لیتی رہی ہو۔ اُس میں تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔ اور پھر مجھے گھسی ہوئی تالیاں ٹھیک کرنا آتی بھی کہاں ہیں۔

زینب۔ یہ کام کیوں نہ سیکھا؟

محسن عقیل۔ یہ تو میرے استاد لالہ کو بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا تو کہا کرتے تھے "یہ کام اچھا نہیں مُفت کی سر کھپائی ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے سیکھا ہی نہیں۔"

زینب۔ اچھا کیوں نہیں؟

محسن عقیل۔ بے کار ہے۔ یہ صرف خول ہی تو رہ جاتی ہیں۔ سرے سے نئے پرزے ڈالو تب جا کر کہیں کام میں آتی ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ کب فیل ہو جائیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ویسے بھی یہ سودا نئی تالی سے گراں ہوتا ہے

(احمد آتا ہے)

احمد۔ (برآمدے سے آواز آتی ہے) اور سُن لو۔ اب ان حضرت کو کیا سُوجھی ہے۔

(اندر داخل ہوتے ہوئے) بی بی مجھے بشیر ابھی راستے میں مِلا کہہ رہا تھا۔ قاسم نازی کو لینے پرسوں یا اترسوں آئے گا۔

زینب۔ ہم تو بابا اب بھیجنے کے نہیں پہلے ہی کیا کم ہو چکی ہے۔ انہوں نے تو ہماری لُٹیا ہی ڈبو دی۔

احمد۔ اب آئے تو ایسا ٹینٹوا دباؤں گا (محسن عقیل کو دیکھتے ہوئے) آہا جناب کیدھر آ بھٹکے؟

محسن عقیل۔ جب سے آیا ہوں یہی سوال ہو رہے ہیں۔ سوالوں کے مارے میرا تو ناطقہ بند ہو گیا ہے۔ میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ تم کو سناؤں گا تو.........

احمد۔ حضور والا! گذارش یہ ہے کہ ایسی یتیموں مسکینوں والی صورت بنا کر آپ ہمیں اُلّو نہیں بنا سکتے۔

محسن عقیل۔ سُنو تو۔

احمد۔ نہیں بننے جی ہم اُلّو کہہ جو دیا ایک بار۔

زینب۔ بشیر کیوں نہیں آیا یہاں؟

احمد۔ کہیں تیزی میں جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اس قلیل عرصہ میں اُس نے مجھے اتنا ہی بتایا۔ دو تین گھنٹے تک شائید یہاں آئے۔

محسن عقیل۔ بھابی۔ ابھی تم پھر دنگا فساد کر کے آئی ہو؟

گُلنا نہ۔ گویا پہلے بھی میں ہی جھگڑا کرتی تھی۔ (وقفہ) یہ دیکھو میری ماں ہے مجھ

ایسی پڑھی لکھی کا ایک اُجڈ کے ساتھ بھلا کیا جوڑ تھا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تو پڑھی ہوں نا۔ اور پھر میری عمر دیکھو اور اُس کو دیکھو۔ شروع شروع میں وہ ذرا ان کے کام آیا زمین الاٹ کروا دی دو ایک چھوٹے موٹے اور کام کروا دیئے تو اس پہ لٹو ہو گئے۔ پتا نہیں انہوں نے کیا سمجھ لیا تھا اُسے۔

محسن عقیل۔ (ہنستے ہوئے) نہیں تم تو نہیں گلناز جھگڑا کیا کرتی تھی (وقفہ) یہ تم عمر وُمر کا کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔ یہ باتیں اب سے بہت پہلے سوچنے کی تھیں اب تنازعہ کرنے سے کیا فایدہ۔ کوئی سمجھوتے کی صُورت نکالو۔

زینب۔ (دروازے کے قریب پہنچ کر) احمد ذرا بات سُننا (گلناز سے) یہ افتخار کا بچہ کہاں مر گیا؟

گُلناز۔ ابھی یہاں تھا کہیں باہر کھڑا ہو گا۔

(احمد اور زینب باہر نکل جاتے ہیں)

محسن عقیل۔ اچھا بھابی اب میں چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو چکی ہے۔ لالہ آئیں تو تم ان کے ساتھ گاؤں چلی جانا۔ ہُوں۔

گُلناز۔ ابھی تو آپ آئے تھے۔ آپ کو جانا کہاں ہے؟ سنیما؟ میں بھی چلوں؟

محسن عقیل۔ چلو اس میں مجھے کیا اعتراض ہے۔

(زینب واپس آتے ہوئے)

زینب۔ یہ تمہارا بھائی بھی عجیب ہی ہے۔ تم بھی اسے کچھ نہیں سمجھاتے۔

محسن عقیل۔ آخر ہوا کیا؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔

زینب۔ ہونا کیا تھا۔ میں بیمار تھی، کئی خط لکھے کہ نازی کو ذرا بھیج دو۔ کوئی جواب نہ آیا۔ پھر میں نے احمد کو بھیج دیا۔

محسن عقیل۔ اس میں تو لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔

زینب۔ (اپنی ہی دُھن میں) قاسم کا چھوٹا بھائی کہنے لگا "ہم نہیں بھیج سکتے اس کی اتنی ہی ضرورت تھی تو ہاتھ پیلے ہی کیوں کئے تھے"

محسن عقیل۔ پھر احمد نے کیا جواب دیا؟

زینب۔ اس بچارے نے کیا جواب دینا تھا۔ احمد نے بڑی عاجزی سے کہا "چند دنوں کے لئے بھیج دو۔ ہم اُسے بہت جلد واپس بھیجنے کی کوشش کرینگے"

محسن عقیل۔ تو انہوں نے بھیج دیا؟

زینب۔ نہیں جی۔ ایسے بھیجنے والے کہاں تھے۔ کہنے لگا۔ ہم نے نقد پانچ سو دیا تھا۔ روپیہ لے آؤ تو لے جاؤ۔ بس وہیں جھگڑا ہو گیا۔

(احمد داخل ہوتا ہے)

احمد۔ کیسا جھگڑا؟

زینب۔ نازی کے سسرال میں........

احمد۔ میں تو بالکل چپ رہا۔ وہ بپھرے ہوئے مجھ پر اُچھل اُچھل کر آئے جیسے بنیلا سؤر قلابازیاں کھاتا ہے۔ بھائی کیا کرتا۔ ایک تو پردیس دوسرے لڑکی

دے دی پھر کہاں بولا جا سکتا ہے۔

محسن عقیل۔ آپ نے روپے لئے تھے؟

زینب۔ ہم نے روپے پھونکنے تھے۔ اس کے ماموں نے اُن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم تو لُٹ لُٹا کر آئے ہیں۔ اس لئے ہماری طرف کا خرچ بھی تم ہی کو کرنا ہوگا۔ خرچ کے لئے روپے لئے ہوں تو لئے ہوں۔ مجھے ان کا علم نہیں۔

محسن عقیل۔ ہوں۔

احمد۔ (زینب سے) چھوڑو اس قصّے کو۔ قصور تو سارا تمہارا ہی ہے۔

زینب۔ ہاں یہ تو میں مانتی ہوں۔ سب نے ہی میری مخالفت کی تھی۔ کہ اتنی سی لڑکی کو کیوں آفت میں ڈال رہی ہو۔ اُس وقت میری ہی عقل ٹھکانے نہ تھی۔

احمد۔ بھگتو اب۔ کرنا تو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ غریب کی زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے تم نے۔

زینب۔ اب تو کچھ بھی ہو جائے میں اسے بھیجنے کی نہیں۔ کیا ہم اسے روٹی بھی نہیں دے سکتے؟

محسن عقیل۔ مگر اس سارے قصے میں لالہ کا کیا قصور ہے؟

احمد۔ وہ کوئی کام دام کرتا نہیں۔ بھائیوں کے سہارے زندگی گزار رہا ہے آج کسی کام پر لگ جائے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

محسن عقیل۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر اُس نے کبھی کوئی کام کیا ہی نہیں۔ پہلے بھی وہ ایسے ہی زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ ہاں پہلے دکان پر جو تھوڑا بہت کام آجاتا تھا اُس سے کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔

احمد۔ یہی تو میں کہتا ہوں دکان پر کام نہیں تو یہاں آجائے۔ ہمارے پاس رہے۔ بڑا شہر ہے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔

محسن عقیل۔ سب کام اُسے پسند نہیں۔

زینب۔ سیانا تو وہ اتنا ہے کہ سارے لاہور کے ایم۔ اے پاس ایک طرف ہو جائیں اور وُہ ایک طرف تو بھی اس کا پلّہ بھاری رہے۔

محسن عقیل۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ آج کئی برسوں کے بعد جبکہ میں اتنا پڑھ لکھ بھی گیا ہوں اُسے اپنے سے برتر ہی سمجھتا ہوں۔ کسی بات پہ اُس سے بحث کر لو۔ نفسیات، جنسیات، فلسفۂ حیات وہ دو قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ ہر فن مولا والا فقرہ اس پر صادق آتا ہے۔ دیکھ لو خود کیا ہے مگر اس کے دوست مفلس ترین لوگوں سے لے کر افسروں تک ہیں۔ یہ بھی تو ایک معجزہ ہے۔ ہے نا۔

گلناز۔ (سسکاری بھرتی ہے) خاک ٹھیک ہے۔ اُس کے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کی بیوی کی مجھ نصیبوں جلی کو ایسی ایسی باتیں سننا پڑتی ہیں کہ ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے (وقفہ) میں اس زندگی سے اوب گئی ہوں عاجز آگئی ہوں۔ انہوں نے مجھ پر سو سو طعنے پہنے لگائے تھے۔ سب ہی کہتے ہیں جب سے یہ کلموہی آئی

ہے مصیبت کی چھایا گھر پر منڈلا رہی ہے۔ مجھے کوئی ملنے آئے جھٹ دروازے کی اوٹ میں آ کھڑے ہوتے ہیں کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں جیسے میں پتا نہیں کیا کرتی ہوں گی خود دونوں گھنٹوں بیٹھے جانے کیا مسکوٹ کیا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کا یہ سیان پنا کہاں جاتا ہے؟

احمد۔ اسے دوسروں کو راہ پر چلانا آتا ہے خود جانے ابھی تک کیوں بھٹکا ہوا ہے۔

زینب۔ میں بڈھی کھلھیار ایسے وقت پر عجیب جھنجھٹ میں پھنس گئی ہوں۔ اسے چھٹکارا دلا دیں تو مصیبت نہ دلائیں تو مصیبت۔ اس وقت تمہارے ابا ہوتے تو ساری چخ پخ سے نجات ملتی۔ چھوٹی بھی مٹیار ہو گئی ہے۔ اس کے بھی ہاتھ پیلے کرنا ہیں کوئی ایک فکر ہو تو کہوں۔

محسن عقیل۔ مقتضائے محبت اور فرض تو یہی ہے کہ اس نفاق و شقاق کی آگ کو بھڑکانے کی بجائے بجھا دیا جائے ورنہ دریائے مصائب کی طغیانی اور زور پکڑ جائے گی اور قصہ ایسی باتوں میں مایوس و برگشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا سب معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

احمد۔ یہ آگ بجھانے سے اور بھڑکے گی (زینب سے) ابا نے کونسا کوہ قاف کی چوٹی پر چڑھ جانا تھا۔

زینب۔ نہیں احمد وہ کتنے بھی برے تھے مگر ان کی بعض باتیں بہت اچھی تھیں۔

احمد (طنزاً) مثلاً شراب پینا، رنڈیوں کے پاس جانا اور ......

محسن عقیل۔ بی بی یہ جن کا تم ذکر کیا کرتی ہو نازی اور احمد کے ابا نہیں ؟

زینب۔ اُن کو تو دیر ہو گئی اللہ کے پیارے ہو گئے۔ مجسٹریٹ تھے۔

محسن عقیل۔ (بے حد حیران ہو کر) مجسٹریٹ ؟

زینب۔ ہاں مجسٹریٹ تھے۔ یہ لکڑی کا صندوق جو پڑا ہے اُنہی کے کاغذات سے بھرا ہے۔ وہ بے حد شراب پیا کرتے تھے۔ اُن کو ورثے میں کافی جائیداد ملی تھی۔ سب اِسی لال پری کی نذر ہو گئی۔ جب مرے تو ہمارے سر ہزاروں کے حساب سے قرض چڑھ چکا تھا۔

محسن عقیل۔ پھر ادا کیا ؟

زینب۔ ادا کیسے کرنا تھا ؟ مکان دکان تو پہلے ہی گروی تھے۔ میرا تمام زیور بھی بک چکا تھا۔ میں اکیلی جان تو تھی، کوئی کمانے والا نہ دلجوئی کرنے والا۔

محسن عقیل۔ احمد جو تھا۔

زینب۔ یہ تو بچپن ہی میں بھاگ گیا تھا۔ وہ شراب پی کر اسے بہت پیٹا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے "یہ میرا دشمن ہے۔ یزید ہے۔"

محسن عقیل۔ ایسا کیوں کرتے تھے ؟

زینب۔ یہ تو میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتی۔ ہاں جب ہوش میں ہوتے تو اسے بہت پیار کیا کرتے۔

محسن عقیل۔ احمد سے ملاقات کیسے ہوئی ؟

زینب - بمبئی میں گڑبڑ ہوئی تو یہ ادھر چلا آیا - یہاں اس کے ایک پرانے دوست نے ہمارا ٹھکانا بنایا۔

محسن عقیل - (احمد سے) حضرت آپ اتنا عرصہ کہاں رہے؟

احمد - میں بمبئی چلا گیا تھا - ایک طویل مدت تک آوارہ پھرتا رہا پھر ایک دن ہمارے شہر کا ایک آدمی مجھے مل گیا - والد صاحب کا بڑا اچھا دوست تھا - وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا جب میں واپس آیا میرا سلسلہ بہت اچھا بن چکا تھا مگر مجبوراً سب کچھ چھوڑنا پڑا۔

محسن عقیل - بی بی نے شادی تو تمہاری موجودگی ہی میں کی ہوگی؟

احمد - شادی تو میرے آنے سے بہت پہلے کر چکی تھیں - گڑبڑ سے بھی بہت پہلے۔

ثریا - (باہر سے آواز دیتی ہے) بی بی ذرا باہر آئیو۔

(زینب باہر چلی جاتی ہے پیچھے پیچھے احمد بھی چلا جاتا ہے - قدموں کی چاپ)

گلناز - میں بی بی سے ابھی پوچھ کر آئی - بس ایک منٹ میں۔

(باہر چلی جاتی ہے)

محسن عقیل - (بڑبڑاتا ہے) لالہ تعریفوں کے پل باندھا کرتے تھے - میری بیوی ایسی ہے۔ میری بیوی ویسی ہے - میری بیوی وہ ہے - کیا ہے اُن کی بیوی میں؟ دولت کی گرمی سے ساری محبت پگھل گئی - بیوقوف یہ نہیں جانتے میں امیر نہیں میرا باپ امیر ہے جس نے مجھے لمبی چوڑی تعداد میں بھیڑیں لیکر دے رکھی ہیں جن کو چرواہے چراتے

ہیں او جن کی نگرانی میں کرتا ہوں۔ اُس کے عوض مجھے اچھا کھانا اور اچھا پہننے کو دیا جاتا ہے۔ مجھے ہر ہفتے اپنے باپ کو حساب دینا پڑتا ہے۔ کہ اتنی بھیڑیں خریدی گئیں، اتنی فروخت کی گئیں۔ اتنی بھیڑوں نے اتنے بچے جنے۔ اب وہ کئی مربعے زمین خرید کر مجھے دے رہے ہیں تاکہ اُس کی بھی میں ہی نگرانی کروں۔ میں کہاں جاؤں ؟ کیا کیا کروں ؟ اور یہ لوگ سمجھتے ہیں میں امیر ہوں۔ بیوقوف کہیں کے اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم سب بھیڑیں ہیں۔

(گلناز اور زینب اندر داخل ہوتی ہیں)

زینب ۔ تُم نے اب کہا ہے تو میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔ مگر جلد آ جانا۔ اس کے ابا ذرا بُرا مانتے ہیں۔

محسن عقیل ۔ ابا ؟

زینب ۔ ہاں میرا نیا خاوند۔ پولیس میں حوالدار ہے۔ جب میری شادی ہوئی تب وہ سپاہی تھا۔ یہاں آکر ترقی ہوئی۔ بڑا سخت ہے۔ جب میں کچھ کہتی ہوں تو مسئلے مسائل شروع کر دیتا ہے۔ پھر مجھے شرم آجاتی ہے مگر تمہارے سامنے کیسے انکار کر سکتی ہوں۔ (گلناز سے) پیسے مجھ سے لیتی جاؤ اپنے لئے جوتی خرید لانا۔ یہ تو بالکل پھٹ چکی ہے۔

محسن عقیل ۔ (حیران ہو کر) سپاہی تھے اس وقت ؟

زینب ۔ ہاں۔ اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے۔ ایسے وقت میں تو ...... خیر چھوڑو۔

ب جلدی سے ہو آؤ پھر اس کے ابا..........

محسن عقیل۔ لیکن بی بی یہ ....

زینب۔ تم شرماؤ نہیں بس ذرا جلدی آ جانا۔ وہ اکثر باہر ہی رہتے ہیں۔ نوکری جو ہوئی۔ آج ان کا پیغام آیا تھا کہ وہ آئیں گے اسی لئے کہہ رہی ہوں ورنہ کوئی بات نہ تھی۔

محسن عقیل۔ مجھے تو ....

زینب۔ دیکھو نا تمہاری تو اور بات ہے۔ وہ غلام عباس ہے نا قاسم کا دوست تمہارے گاؤں ہی کا تو ہے۔

محسن عقیل۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ یہاں کسی دفتر میں کلرک ہے۔ پرلے درجے کا لفنگا ہے۔

زینب۔ ایک دن اُسے قاسم یہاں لے آیا۔

گلناز۔ ہاں اور زبردستی مجھے پکڑ کر اُس کے سامنے بٹھا دیا۔ میں نے چھڑانا چاہا وہ اڑ گیا۔ میں نے پردہ کیا تو میرا دوپٹہ کھینچ کر پرے پھینک دیا۔ میں مارے شرم کے زمین میں ہی گڑ گئی۔

زینب۔ دیکھو یہ کوئی مناسب بات تھی؟ اب وہ ہر دوسرے چوتھے آ جاتا ہے۔

گلناز۔ مجھے گھورتا رہتا ہے۔ بہت بُرا لگتا ہے وہ مجھے۔

زینب۔ کل آیا تو کہنے لگا دونوں بہنوں کو میرے ساتھ بھیج دو۔ آجکل میری بیوی

بھی یہاں سے دو چار دن رہ کر آجائیں گی۔

محسن عقیل۔ اس کی بیوی ہے ہی کہاں؟

زینب۔ مجھے معلوم ہے۔ اب آیا تو میں صاف کہدونگی یہاں نہ آیا کرے۔ ہم کو اِن لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ قاسم آیا تو اُس سے بھی کہدونگی اپنے دوستوں کو اپنے پاس ہی رکھا کرے۔ یہ کوئی مناسب بات ہے؟

محسن عقیل۔ (ذرا غصّہ میں آجاتا ہے) عجیب آدمی ہے لالہ قاسم بھی۔ مَیں تو اُسے ایسا نہ سمجھتا تھا۔

زینب۔ اچھا اب تم جاؤ۔ جلد آجانا۔ احمد کی تو کوئی بات نہیں۔ وہ کسی بات کا بُرا نہیں مانتا۔ مگر اس کا آنا ذرا سخت ہے۔ کیا کیا جائے تم جانتے ہی ہو زمانہ کیسا جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ آدھی تنخواہ تو میری بیماری ہی پہ خرچ ہو جاتی ہے۔ آخر دِن کاٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

مُحسن عقیل۔ مگر بی بی........

زینب۔ ہاں بہت دُور نہ جانا دیر..........

(زینب مایوس زندگی کی ساری تھکن لئے ہوئے باہر نکل جاتی ہے۔
پاؤں کی چاپ)

گُلناز۔ میں ذرا لباس تبدیل کرلوں بس دو منٹ میں تیار ہو جاؤنگی۔

(پاؤں کی چاپ)

محسن عقیل۔ اب میں چلتا ہوں۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔

(گلناز اس کی بات پر دھیان نہیں دیتی دوسرے کمرے میں داخل ہو جاتی ہے)

محسن عقیل۔ (آہستہ آہستہ اپنے آپ سے) عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔ میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ اپنی سب ہانکے جاتے ہیں۔ بیوقوف لڑکی! یہ نہیں سمجھتی کہ میں اتنی دیر ہی محبت کرتا ہوں جب تک تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ جب تم اس کی کچھ نہ رہی تو میری کیا ہو سکتی ہو؟ میں اپنے اتنے عزیز دوست کے ساتھ کبھی فریب نہیں کر سکتا۔ وہ انگریزی کی ضرب المثل بالکل ٹھیک ہے۔ "صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں"۔ یہ لوگ محبت کو اندھیرا عمیق ترین کھڈ کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا محبت آسمان پر چمکتا ہوا ستارہ نہیں۔ یہ لوگ خواہ مخواہ روشنی کو نظر انداز کر کے اندھیرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان عشرت و افلاس کے ماروں کے درمیان صرف دولت ہی کیوں حائل ہوتی ہے۔ یہ لوگ کسی قدر تھڑدلے اور پیاسے ہیں نہیں یہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کو شبانہ روز نے جو دکھ کی طرح کالے اور مصیبت کی طرح بھیانک ڈراؤنے ہیں نے ایسا بنا دیا ہے۔

(گلناز داخل ہوتی ہے۔ بارش بند ہو چکی ہے)

گلناز۔ میں بالکل تیار ہوں چلئے۔

محسن عقیل۔ بادل پھر اکٹھے ہو رہے ہیں کہیں ہم بھیگ نہ جائیں۔

گلناز۔ ایک دفعہ تو آپ بھیگ چکے ہیں ایک بار اور سہی۔

محسن عقیل۔ نہیں بھابی میں کبھی نہیں بھیگوں گا۔ یہ تمہارا محض خیال ہے۔

گلناز۔ ابھی میں نے خود دیکھا ہے۔

محسن عقیل۔ وہ تو ہوا کی نمی کا اثر تھا جواب زائل ہو چکا ہے۔ بھابی میں کبھی نہیں بھیگنا چاہتا اب مجھے جانے دو۔ دیکھو کیچڑ کا لجلجا مادہ اکٹھا ہو رہا ہے کہیں میں اس میں پھنس نہ جاؤں۔

گلناز۔ اس اندھیری سڑک پہ اکیلے ہی جاؤ گے؟

محسن عقیل۔ یہ ٹھیک ہے ایسے موقعوں پہ بڑے بڑے جیالوں کے دل دہل جاتے ہیں مگر بھابی میں نے اس سے کہیں ویران سڑکوں پہ اکیلے سفر کیا ہے۔

گلناز۔ میں آپ کو ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔

محسن عقیل۔ تم نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اچھا اب اجازت دو۔ بھابی میں بھول گیا تھا گھسی ہوئی تالیاں مرمت نہیں کی جاتیں بلکہ بدلنا پڑتی ہیں۔

گلناز۔ میں سمجھی نہیں۔

محسن عقیل۔ ہر وقت گرگٹ کی طرح رنگ نہ بدلتی رہا کرو۔ اپنا اصل روپ ہی اچھا ہوتا ہے۔ اس رنگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

گلناز۔ کچھ پلے نہیں پڑا۔

محسن عقیل۔ اپنی قمیصیں کھلی سلوا لو اچھی رہو گی۔ تنگ قمیصیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ جلد پھٹ جاتی ہیں۔

گلناز۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

محسن عقیل۔ چادریں صندوقوں کے اندر ہی اچھی لگتی ہیں باہر نکلتے ہی انکی ساری چلبلاہٹ غائب ہو جاتی ہے۔

گلناز۔ میری سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا۔

محسن عقیل۔ تم نہیں سمجھ سکو گی۔ تم گندی گھناؤنی مسموم دلدل میں پھنس گئی ہو۔ خدا حافظ۔

افتخار۔ (اندر داخل ہوتے ہوئے) بھیا بہت دیر ہو چکی، اب جلد چلو کھیل شروع ہونے والا ہو گا۔

محسن عقیل۔ بیوقوف تم اتنی دور جا کر کیا دیکھو گے۔ یہ دور کے کھیل تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ تمہارے پاس اتنا بڑا کھیل شروع ہو کر ختم ہو گیا۔

(جلدی سے باہر نکل جاتا ہے۔ قدموں کی
چاپ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہے)

چھماں

میرے کارخانے اور ان کے مکان کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی جو حد بندی کا احساس دلاتی تھی۔ میں نے تانے پر پڑے ہوئے چھجے کی دراڑ سے اُسے جھانکا۔ اس کے گول معصوم چہرے، چھوٹی سی پتلی ناک، طفلانہ رُخسار اور پرُوش سیاہ آنکھوں سے ایک خاص قسم کی انانیت ٹپکتی تھی۔ اُس کا قدو قامت نہائیت خوش قطع و خوش آئند تھا، مگر ہنوز اُس کی بالیدگی دلنشو ونما تشنہ تکمیل تھی۔ میرے دل میں جہاں ایک خلش سی پیدا ہوئی وہاں میں نے یہ خوف بھی محسوس کیا کہ یہ راز کہیں افسانہ نہ ہو جائے، اس گھمبیر ڈراؤنے خیال کے آتے ہی میرا دل سہم سا گیا وہ سُکڑ سا گیا اور میں نے اسے ادھورا ہی چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔

میرے دماغ میں دو خیال تھے جو گتھم گتھا ہوا کرتے۔ اور کبھی ڈھلکیاں کھانے لگتے۔

"مجھے جس کو محلہ میں استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے یہ بھید کھُل گیا تو؟

اور اگر اُسے میں پالوں تو سارے جہان کی مسرتیں مل کر بھی مجھے ایسی روحانی ایسی جانفزا خوشی نہ بخش سکیں گی۔"

چند دن تو یونہی گذر گئے مگر اس عرصہ میں اول الذکر سوال آہستہ آہستہ ہلکی سی دھند میں لپٹتا چلا گیا ——— "اوکھلی میں دیا سر تو موصلوں سے کیا ڈر۔"

میں اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا جیسے دو پرانے آشنا ہوں۔ یا کسی اُدھیڑ عمر شخص کو شبِ عروسی یاد آجائے اور ساری زندگی کا پیار اپنی بیوی کو دے دینا چاہے۔ مجھے اس طرح دیکھ کر وہ استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ پھر وہاں موجود تھی۔ دو گھنٹے تک یہی رہا۔ ہر پانچ منٹ میں اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر۔ اتنی بار مجھے سیڑھیاں اترنا چڑھنا پڑتیں تو میں بھی تھک جاتا۔ مگر اُسے نامعلوم کس جذبۂ ایثار کے تحت تھکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔ "اس کی رانوں میں مچھلیاں دوڑنے لگی ہونگی" میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی اور میں نے اپنی خفت کو مٹانے کے لئے میز پر پڑی ہوئی گھنٹی کو زور زور سے بجانا شروع کیا۔ "حضور میں یہاں ہوں"۔ "آؤ! ایک گلاس پانی" اور جب میں نے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھانا چاہا تو ہمت مفقود تھی۔ "ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"۔ یہ فقرہ لٹو کی طرح دماغ میں گھومنے لگا اور یاروں کا ہاتھ پتا نہیں کب گھنگھریالے بالوں پر پھرتا پھرتا پیشانی پر آ رکا۔ اُدھر بھی شاید یوں ہی ہوا اور پھر مسکراہٹ، ہی مسکراہٹ اُسے نیچے دھکیل کر لے گئی۔ اس طرح ائتلاف کی دلفریب چادر البیلی شفق کی طرح طاقتِ غیبی نے ہم پر اوڑھ دی۔

وہ اپنے مکان کی پہلی منزل میں بیٹھی گھٹنوں پر کپڑا رکھے کچھ کاڑھا کرتی اور میں کارخانے کے صحن میں کرسی کا منہ اس کی طرف کئے عین سامنے بیٹھ کر بظاہر بڑے بڑے رجسٹروں کی ورق گردانی کیا کرتا۔ ہماری نگاہیں اکثر ٹکرا جاتیں، ہم شدید جھٹکے محسوس کرتے، پھر قبر کی سی خاموشی چھا جاتی مگر حساس دل کا ہر تار وفورِ کیف سے کانپنے لگتا اور

کبھی جانے کیوں پہلے سے بھی تیزی سے دھک دھک کرنے لگتا۔ مجھے اکثر اندر جانے کی ضرورت محسوس ہوتی مگر میں اتنا کاہل اور سست بن گیا تھا کہ اپنی کرسی سے ہل بھی نہ سکتا۔ حتیٰ کہ شام ہو جاتی اور پھر اندھیرے کی سیاہ چادر اُس کے سیمیں جسم کو اپنے اندر لپیٹ لیتی۔ میرے خیالات دہکنے لگتے، ان کی گرم روشنی میری بے بسی پہ چھا جاتی اور تپش مجھے بھسم کر ڈالتی۔

"مجھے اس سے کیا کہنا چاہیئے؟" اس کا میں کبھی بھی فیصلہ نہ کر سکا، دن ڈھل جاتا شام ہو جاتی اور ہم یونہی بیٹھے رہتے، اگر ہمارے بس کا روگ ہوتا تو ہم ایک بار ضرور پھر سورج کو پیچھے دھکیل دیتے۔ شام ہو جاتی اور تابندگیٔ شام جو پہلے آتشیں ہوتی، پھر صاف سُرخ اور پھر زرد دھندلی آہستہ آہستہ تاریکیٔ شب میں جذب ہو جاتی۔

ایک روز جب ظلمت شب رخصت ہوئی اور آفتاب خراماں خراماں جلوہ افروز ہوا تو میں بھی کارخانے میں تشریف لے گیا۔ وہ سورج کی روپہلی شعاعوں میں نہا رہی تھی۔ بلاؤز میں نکلی ہوئی گوری گوری ننگی باہیں تڑپتی ہوئی مچھلیاں اور ہونٹوں پہ ایک فیاضانہ تبسم نمودار، شوخ رنگ کے ریشمی کپڑوں میں ملبوس، دل پھڑکنے لگا جیسے بھیگی خزاں کے بعد خوش الحان بہار نظر آ گئی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں، چہرے میں، اور بالوں میں ایسی کشش تھی جو بے طرح دل کو کھینچتی تھی اور کھینچے ہی لئے جاتی تھی۔

میری اندھیری زندگی میں وہ ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی اور جھلمل سا اُجالا اِس تاریکی کی رگوں میں دوڑ گیا جو میری زندگی کی روشنی "حمیدہ" کے کھو جانے سے

میرے دل پر چھا گئی تھی۔ اُس کو اپنی طرف کھنچتے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے مجھے اُس تنگ و تاریک کوٹھڑی سے باہر نکال دیا ہے جس میں سیل تھی اور جہاں گھوڑوں کی لید اور پیشاب کی بدبو تھی اور اب میں لطیف تازہ، متحرک و متموج، ہواؤں میں گھوم رہا ہُوں۔ میں جذبات کی اُس دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں مسرت، نُور اور حُسن کی گرمی ہے، محبت کا لوچ ہے۔ اُس وقت میں بالکل بے خوف تھا، دنیا بھر کے خطروں سے آزاد۔ سب کچھ بھُول کر ہی تو محبت کی جا سکتی ہے۔

چھیماں کے لئے رحم کا ایک بے پایاں سمندر میرے دِل میں موجزن ہو اُٹھا اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اس نازک تیلی کو کبھی برباد ہوتا نہیں دیکھوں گا۔ عزیز اور بشیر کتنے ہی بلیک میلر سہی مگر یہاں تک پہنچنے کے لئے اُنہیں بھی ایڑھی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا اور میں متواتر ہر روز اُسے اپنانے کے لئے یوں منصوبے باندھنے لگا گویا یہ میرا فرضِ منصبی ہے۔

اُس کی محبت میرے لئے بیک وقت وجۂ مسرت و پریشانی، موجبِ راحت و کلفت بنی۔ کیونکہ گزرے ہُوئے واقعات کا جو مجھے رالوں نے بتائے تھے بہت بعد میں پتہ چلا تھا۔ رالوں کی ماں ان کے گھر میں کام کرتی تھی اور رالوں ہمارے گھر کے برتن صاف کیا کرتی۔ رالوں کا آنا جانا قریب قریب گلی کے سب گھروں میں میں تھا۔ اِس لئے اُسے محلے کی ہر بات کی خبر ہوتی تھی، رومانی کی بھی اور غیر رومانی کی بھی مگر رومان اُسے زیادہ مرغوب تھا۔ یہ رالوں کی ایک خاص صفت تھی کہ اُسے ہر

گھر کی رومانی کہانیاں از بر یاد تھیں جو اُسے ہضم نہ ہُوا کرتی تھیں اور جنہیں وہ جہاں بیٹھتی وہیں بڑے چٹکھارے لے لے کر سنایا کرتی۔ اُسے دھوبی کی لڑکی سے لے کر فیکٹری کے منیجر کی میم تک کے رنگیلے ڈرامے بمعہ پلاٹ اور ڈائیلاگ کے اچھی طرح ذہن نشین تھے۔ راتوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔ کہ ایک دن عزیز اور بشیر ایک سینڈل ایک بندوں کی جوڑی، کیوٹیکس پاؤڈر، اپرانزہ اور ریشمی رُومال چھیماں کے لیئے لائے۔ مگر چھیماں نے یہ چیزیں لینے سے انکار کر دیا وہ کہتی تھی۔ "میں ان چیزوں کو کہاں رکھوں گی امی کو پتہ چل جائیگا۔"

گو یہ واقعہ میرے یہاں آنے سے پہلے کا تھا مگر پھر بھی ان باتوں کا خیال آتے ہی حقارت کا جذبہ سفید ورق پر موٹے موٹے کالے حروف کی طرح دل پر اُبھر آتا۔

"عزیز اور بشیر کے متعلق میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ اُن کی گاڑھی چھنتی تھی اور وہ ہر نئے مال کو بڑے خلوص سے ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھا جاتے تھے۔ اُن کے پاس بلیک مارکیٹ کا روپیہ عام تھا۔ اس لیئے کوئی نہ کوئی نیا مال اُن سے بلیک میل ہوتا رہتا تھا۔"

رفتہ رفتہ عزیز اور بشیر کی جگہ میں نے لے لی کچھ تو یہ کہ دونوں میری وجہ سے جھجک محسوس کرنے لگے تھے اور کچھ وہ خود بخود میری طرف کھنچتی آ رہی تھی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب اُن سے اُس نے قطع کلام کر لیا۔ حالانکہ میں نے اُن کا اور ان کے سفلے پن کا اُس سے کبھی بھی ذکر تک نہ کیا تھا۔ اب ہمارا افسانہ یوں چلنے لگا کہ سارا دن

سارا دن دھوپ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہتے۔ ہمارے اُوپر اور نیچے ہر شئے مسرور و شادماں، تاباں و فرحاں تھی۔ میرا قلم دیو قامت رجسٹروں پہ ہوتا اور آنکھیں اُس کی کسی آرٹ کے بہترین نمونے پر۔ اسی طرح وہ بھی رنگ برنگے دھاگے اور کپڑا اپنی ترپتی ہوئی رانوں پہ رکھے بیٹھی رہتی۔ جب کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی یا ہوا کی وجہ سے کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ ہی ہوتی وہ جلدی سے سر جھکا کر کچھ کاڑھنا شروع کر دیتی اور میں رجسٹروں پہ سُوکھا قلم ہی پھیرا کرتا۔ تجدید الفت و تالیف قلوب کا یہ کیسا دلگداز منظر ہوتا۔ ہمارے لئے دنیا فردوس سے بدرجہا شگفتہ اور پُر لطف بن گئی تھی۔ میں وہ آوارگی وہ یاس و حرماں نصیبی، وہ اُداسی اور بے چینی سب کچھ بھول گیا۔ جو میرے سینے کی قندیل حمیدہ کو فطرت کے ابدی سیاہ پردوں میں لپیٹنے کے عوض مجھے ملی تھی۔

"میرے ذہن کے کسی گوشے میں شائد یہی جلن زندگی کا
سارا انتظام درہم برہم کر رہی تھی۔ میرے غم کا مداوا
"چھیماں" تھی۔ مگر جسے میں اپنے غم کا مداوا سمجھتا رہا
زہر میں بجھا ہُوا نشتر نکلا"۔

ہماری محبت کا علم چھیماں کی ماموں زاد بہن کو بھی ہو گیا تھا جو کچھ دنوں کے لئے یہاں آئی تھی مگر اس کی ہستی ہمارے لئے معاندانہ ہونے کی بجائے مویدانہ ثابت ہُوئی شائد اس لئے کہ اُس نے خود بھی لو میرج کی تھی۔

"وہ اپنی مرضی سے چُنے ہُوئے خاوند کے ساتھ بڑے

ٹھاٹ سے زندگی بسر کر رہی تھی اس کی زندگی میں مسرتیں
اور خوشیاں اسی طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے بہار کے
دنوں ٹھنڈی چاندنی میں لال زرد قرمزی اور ہلکے نیلے
کھلے ہوئے نازک و نرم پھول یا جیسے اندھیرے کی
گہری دبیز سیاہ چادر پہ چمکتے ہوئے ستارے۔"

اُسے ہم دونوں سے ہمدردی تھی۔ "زندہ صورتیں قبر میں دھکیلتے دیکھ کر کس کا دل نہیں پسیجتا"۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ بھی میری طرح چہکیں، گائیں اور پھدکتے پھریں۔ وہ نازک اندام، شریر، متکبّر اور نفاست پسند لڑکی تھی۔ مجھے چھیماں نے ایک بار بتایا تھا کہ اُس نے چھیماں سے پوچھا۔ "کیا تم اُس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟ میری تھوڑی سی کوشش بھی تمہیں ایک ہی پگڈنڈی پر لا کر کھڑا کر سکتی ہے"۔ چھیماں نے ناک سکوڑ کر شرارت آمیز لہجہ میں مجھ سے کہا۔ "میں نے جواب دیا۔ "نہیں" معلوم نہیں! شاید ہاں ہی کہی ہو مگر مجھے چھیماں نے یہی بتایا کہ اُس نے نفی میں جواب دیا تھا۔ چھیماں کی بھابی اور ماموں زاد بہن ہمارے گھر دوسرے چوتھے روز آجایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی چھیماں بھی ساتھ چلی آتی تھی۔ مجھے اُمی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ چھیماں کی ماموں زاد بہن جب بھی آتی ہے یہی پوچھتی ہے کہ "میری شادی کہیں طے کی ہے یا نہیں"؟ اُس کے بعد بات مذاق میں اُڑ جاتی۔

اب ہم فلم کے ہیرو اور ہیروئین کی طرح اکثر ملاقات رات ہی کو کیا کرتے کیونکہ دن کو ارد گرد کے تمام لوگ ہمیں جھانکا کرتے۔ دوسرے یہ بھی بات تھی کہ چھیماں کی بھابی

بھی کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھا کرتی۔ سوائے چھیماں کی ماموں زاد بہن کے کسی کو اس بات کا علم نہ تھا۔ در اصل اس کی بھابی مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی۔ وہ دن کو بھنورے کی طرح کوٹھے پر چکر کاٹا کرتی اور ایک چکر میں تین یا چار مرتبہ وہ مجھے ضرور دیکھتی۔ اُس کی آنکھیں بادامی لمبے اور گھنے بال، چاند کی کرنوں ایسا رنگ، لمبی پلکیں، بلا کی خوبصورت تھی۔ سچ پوچھو تو کسی کسی وقت میں چھیماں سے بھی زیادہ اُس میں دلچسپی لینے لگتا۔ مجھ میں دلچسپی لینے کی شاید یہ وجہ بھی ہو کہ وہ اپنے بے کار خاوند سے اُکتا چکی تھی جو اچھا بھلا میانہ قد کا مضبوط پٹھوں والا مرد تھا۔ ڈھیروں شرافت اُس کے بُشرے سے عیاں تھی۔ مگر "بے کاری کا محبت سے کیا تعلق ہے؟"

"یہ فلسفۂ حیات بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسے بہت کم لوگ سمجھتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں عوام انہیں پاگل کے لقب سے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا پاگل عوام ہوتے ہیں یا فلسفی۔"

عزیز اور بشیر دونوں کی بیویاں جو کبھی باہر نہ نکلی تھیں اب رعنائی اور بانکپن کی وہ دلدوز ادائیں جنہیں صرف ارتقاءِ حسن ہی سکھا سکتا ہے دکھاتی پھرتی تھیں۔ انہیں اب کھڑکی میں کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی دو ایک بار مجھ سے بھی نظریں ملیں مگر میری غیر دلچسپی سے معاملے نے طوالت نہ پکڑی شاید وہ اپنے خاوندوں کے عظیم الشان کارنامے سُن سُن کر بغاوت پر آمادہ ہو گئی ہوں یا شاید غمِ پنہاں کی دوا چاہتی

ہوں۔ کچھ تو ہوگا۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جتنی بھی اس وقت زیبائش و رعنائی کی پیکر مجسم نظر آرہی ہیں سب اپنی جری و شوخ چتونوں سے دنیا کو ملوث کر لینے کی آرزو رکھتی ہیں۔ یہ کسی سے محبت نہ کر سکنے والیاں مہارانیاں اپنے خاوندوں کا انتقام دوسروں سے یوں لینا چاہتی ہیں۔ ان کے جسم میں زہر ہے، ان کی نگاہیں سم آلود ہیں اور یہ وہ ناگنیں ہیں جن کو دنیا کی سماجی اور معاشرتی حالت نے اس عالم میں قہر، تنفر اور حیرت پھیلانے کے لئے چاروں طرف منتشر کر رکھا ہے۔

رات کو میں کوئی گہرے رنگ کی پتلون پہنا کرتا اور سردی سے بچنے کے لئے گہرے سبز رنگ کا کمبل اوڑھ لیا کرتا۔ مجھے چاندنی راتوں کی نسبت سیاہی میں ملفوف ڈراؤنی راتیں بے حد پسند تھیں کیونکہ سرد، یخ، منجمد ڈراؤنی راتوں میں ہمیں کوئی نہ دیکھ پاتا، کوئی باہر نکلنے کی جرأت ہی نہ کرتا تھا اور پھر اندھیرے میں کسی کو خاک نظر آتا۔ یہ چاندنی راتیں بھی ایک ہی سفلی کمینی ہیں وہ رات ہی کیا جس میں ہر شے صاف دکھائی دینے لگے۔ میرے یہ گہرے رنگ کے کپڑے بڑے کار آمد مفید ثابت ہوتے کیونکہ اول تو ہم کسی کو نظر ہی نہ آتے اور اگر کوئی قریب سے دیکھ بھی لیتا تو اسے صرف ایک سیاہ بھوت بھاگتا اور اندر داخل ہوتا نظر آتا۔ یہ کوئی نہ کہہ سکتا کہ یہ دو بھوت تھے یا انسان۔ یہ انسان یا بھوت کبھی بھی پہچانے نہ جاتے۔ کاش ہمیشہ اندھیری راتیں ہوا کرتیں۔

چھمیاں کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ یہ رنگ شباب کے عالم میں یونہی بے انتہا

دلفریب و دلکش ہوتا ہے چھیماں کے رنگ میں یہ خصوصیت اور بھی زیادہ قیامت خیز تھی اُس کی رانوں میں مچھلیاں اِدھر اُدھر بھاگا کرتیں اُس کی اٹھتی ہوئی جوانی، اُف! ناز و کرشمہ کی محشر خیز فسوں زائیاں توبہ!! توبہ!!

جب میرا ہاتھ پہلی بار اُس کی نوخیز چھاتی پر جا پڑا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا ہاتھ کیلے کے نو وارد تنے پر آن پڑا ہے۔ اس کی گرمی سے جانے کیوں میرے ہونٹوں کے کونے پھڑکنے لگے ——— شاید ساری گرمی چوس لینا چاہتے ہوں۔

ہم ہر رات ملا کرتے تھے، چاہے طوفان آجائے، جھکڑ چلے یا دِل کے آر پار ہو جانے والی رعد کی گرج ہو۔ چھیماں کشیدہ قامت لچیلے انداز کی حد درجہ نازک لڑکی تھی۔ اس کے خدوخال کی موزونیت، چہرے کی ساخت اس قدر متناسب تھی کہ نگاہ جس جگہ پڑتی وہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی۔ ایک رات چھیماں سے میں نے کہا۔ "چھیماں میرا جی چاہتا ہے تجھے سرسوں کے پھولوں کی طرح مسل کے رکھ دوں اور پھر تمہاری سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے لگوں۔ تیرا انگ انگ حسین ہے، تیری ہر شے متناسب اور جاذبِ نظر ہے، تیرا جسم ایسا ہے جیسے امریکن ربڑ کی گڑیا تیرا ہر عضو یوں تنا ہوا ہے جیسے ڈیوٹی پر کھڑا ہوا ملٹری کا سپاہی۔ تیرا جسم جب میرے بدن سے مس ہوتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سراپا میرے اندر خون دوڑنے لگا ہے۔ جب میں نے ایک لمحہ کے لئے اُسے دیکھا تو اس کا سر شرم سے نیچے جھکا جا رہا تھا اور دوشیزگی اُس کے عضو عضو میں سانس لے رہی تھی۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا" گدرائے ہوئے جوبن کا

دلکش ابھار۔ اُف توبہ!! وہ شرم و انفعال سے مغلوب ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر لب نہ کھل سکے اور میرے ہونٹ اُس کی پھڑکتی ہوئی شاہ رگ کے دائیں طرف پیوست ہو گئے۔

ہم یوں جمٹ گئے جیسے پھر کبھی جدا نہ ہونگے اور پھر وہ سسکیاں لینے لگی۔ "اگر ہمیں الگ الگ راستے پر چلنا پڑا تو؟" "چل پگلی ایسی باتیں نہیں کیا کرتے"۔ میں نے اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنس دی، آنکھوں کے آنسو ڈھلک کر گالوں پر رُک گئے، ہونٹوں پر پیاری پیاری مسکراہٹ جیسے کھلتے ہوئے گلاب کے پھول پر شبنم جمع ہو گئی ہو۔ "اگر میں آپ کا ساتھ نہ دے سکی تو جانتے ہیں آپ میں کیا کرونگی؟" "افیون کھاؤنگی! پانچ دس سیر!!" "بیوقوف!! ایسی باتیں نہیں کیا کرتے"۔ میں نے اُس کی ناک امیٹھتے ہوئے کہا اور پھر اُس کے ہونٹوں سے ہنسی کے پھوارے پھوٹ نکلے۔

جس کی کشتی کنارے کے قریب آ کر ڈوب جائے اُس سے زیادہ بدقسمت انسان اور کون ہو سکتا ہے۔ اُنہی میں میں بھی ایک ہوں۔ ایک دن اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بے خبری کے عالم میں مجھے گہرے کھڈ میں دھکا دے دیا گیا ہو اور میں لڑھکنیاں کھاتا نیچے ہی نیچے چلا جا رہا ہوں۔ میرے کانوں میں کوئی بھیانک آواز پڑی۔ شاید یہ راکوں کی آواز تھی۔ "وہ کل جا رہے ہیں؟ چھیماں نے کہا ہے آج رات کارخانہ کا دروازہ کھلا رکھنا" اُس کا دوسرا فقرہ یہ تھا جسے میں اُس وقت پوری طرح سمجھنے نہ پایا تھا۔ یہ سنتے ہی میں بحرِ ظلمات میں ڈوب گیا اور درد کی ٹیسیں اُٹھ اُٹھ کر مجھے لرزہ براندام کرنے لگی میں خشم آلود لہجے میں چیخا۔ "اچھا"۔ راکوں خوف کے مارے دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ٹک ٹک میری

طرف تکنے لگی۔ "اُسے کہنا آ جائے۔ دروازہ کھول رکھوں گا۔" رانی فاتحانہ ہنسی ہنستی ہوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی گئی مگر میں اب بھی سوچ رہا تھا۔ کہ "یہ ہوا کیا؟" "ہوا کیا ہوا کیا"۔ میرے دماغ میں گھومنے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے زرد، سُرخ سیاہی مائل مبہم سے حلقے بنتے بگڑتے رہے۔ میرے مزاج کی مستقل دلوادہ تنزلزل ہو گئی۔

مجھے پھر ان ویرانوں میں پھینک دیا گیا جہاں سے میں ایک دفعہ پہلے بھی ہو آیا تھا اور جہاں اب مجھے پہلے سے کہیں زیادہ ڈر اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس تخیل میں گھومنے کے بعد میں غائیت درجہ سنجیدہ ذہنیں ہو گیا۔ میں محبت میں بس کہ بھی پوری طرح اظہارِ تعشق نہ کر سکا تھا وہ چلی جائے گی اور پھر جانے کب ملاقات ہو اور شاید کبھی نہ ہو۔ میں کتنا بد نصیب ہوں۔ میری محبت ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا اتنی بیدردی سے گلہ گھونٹ دیا گیا۔

"اس دُنیا میں کانٹے زیادہ اور پھول کم ہیں۔ خوشی کا حلقہ بالکل محدود ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کی قسمت میں ہوتی ہے مگر وہ بھی ہمیشہ اُس سے کچھ زیادہ مستفید نہیں ہو سکتے۔ گنتی کے چند لمحے ہوتے ہیں جو بہت جلد بگولے کی طرح گزر جاتے ہیں اور پھر انسان پہلے سے کہیں زیادہ تلخیاں محسوس کرتا ہے۔"

ہم سماج کے روح فرسا احکام کے کیوں تابع ہیں؟

ہم میں کیوں اس گھسے پٹے سماج کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہیں؟

ہم کیوں ابھی تک اس دقیانوسی ماحول کا خول نہیں اُتار سکے؟

میں نے شام سے ہی چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ رات کے بارہ بج گئے کوئی نہ آیا ہر سُو اندھیرا تھا اور کوئی اُمید کا پہلو نظر نہ آ رہا تھا۔ ہار کر دروازہ کھولا اور ایک مشین کو جنبش دی ٹھک ٹھک...... ٹھا۔ اُس نے پھر دو تین بار ٹھک ٹھک کیا۔ شروع میں میں نے اُسے بلانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ نہ آئی۔ رات کے دو بج گئے اور میں نے سوچا شاید اب وہ نہ آ سکے۔ جب میں دروازے میں تالا لگا رہا تھا تو میں دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ جب میں محبت کرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو مجھ میں اس کی شکست کے صدمے کو بھی برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہیئے۔ مجھے یقین آ گیا کہ زندگی میں آنے والے دنوں کی بنیادیں اسی دکھ اسی درد پر استوار کرنا ہوں گی۔ بیتی ہوئی تمام جھلکیوں کے نقوش جو میرے دل و دماغ پر مرتسم تھے وقت کے غبار میں دبنے شروع ہو گئے۔

صبح ہو گئی۔ میرا چہرہ تپ رہا تھا اور تانبے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا جیسے سارے جسم کا خون سمٹ کر چہرے پر جمع ہو گیا ہو۔ راکوں سے میں نے نیا پتہ منگوا بھیجا۔ جواب ملا وہاں پہنچ کر خط لکھوں گی۔ تلخی اور ناکامی سائے کی طرح میرا تعاقب کر رہی تھی۔ طرّہ یہ کہ جواب میں یہ بھی کہا گیا "منڈھیر پہ ساری رات انتظار کرتی رہی ہوں" خدا جانے وہ کونسی منڈھیر تھی میں سوچنے لگا ابھی وہ سامان تانگے پر لاد دیں گے

مجھ سے یہ سماں کہاں دیکھا جائیگا۔ اسی طرح کے اور کئی لغو سوالات دِل کو اُکساتے رہے تھے اور ذہن کا توازن خراب ہی ہوتا جا رہا تھا۔ میں شہر چلا گیا اور اِدھر اُدھر فضول گھومتا رہا جیسے سرکاری سانڈ۔ مگر وہ تو دنیا بھر کے تفکرات سے آزاد ہوتا ہے وہاں بھی طبیعت کو چین نہ آسکا۔ دِل کے اندر ایک عجیب سا لاوا اُبھر رہا تھا یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سب پردے چاک کر کے بہہ نکلے گا۔ وہ دِن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اولے تڑاخ تڑاخ پڑ رہے تھے اور میں اولوں کی مار کھاتا ہوا سائیکل پر واپس آ گیا تھا۔ اصل میں مجھ میں اور زیادہ باہر ٹھہرنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ واپس آتے ہی رانو سے پتہ چلا کہ وہ جا چکے ہیں

"زندگی میں کیسے کیسے حادثے آتے ہیں پھر بھی انسان موت سے ڈرتے ہیں۔ شاید یہ نہیں جانتے موت ایک نہایت ہی حسین دیوی ہے۔ مجھے یقین ہے جو اس کی ایک جھلک بھی دیکھ چکا ہو گا زندگی کی پھر کبھی خواہش نہیں کریگا۔"

میں صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میری آرزوؤں کا ستارہ کیوں غروب ہو گیا؟ بدنصیبی میرا کاشانہ کیوں بن گئی؟ رانو نے میری پھر اُمید بندھائی۔ گاڑی رات کے نو بجے جاتی تھی۔ وہ جگہ حاصل کرنے کے لئے کافی دیر پہلے ہی چلے گئے تھے۔ میں فوراً بس پر سوار ہو بڑے اسٹیشن پر پہنچا اور تلاش شروع کر دی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں نے اُنہیں ڈھونڈھ ہی لیا۔ گاڑی کے اندر بالکل اندھیرا تھا اور ایک ویران پلیٹ فارم

پر کھڑی تھی۔ بالکل ویران۔ جیسے میری زندگی۔ یہ وہ ڈبے تھے جو گاڑی آنے پر اُس کے ساتھ لگنے تھے اور میری زندگی کے ڈبے جو گاڑی کے انتظار میں نا اُمید ہو چکے تھے کیسا جانکاہ سماں تھا۔ ڈبے ابھی سے کھچا کھچ بھر گئے تھے۔ میں نے ایک ایک ڈبے میں انہیں تلاش کیا مگر کہیں پتا نہ چلا۔ واپس آنے ہی کو تھا کہ اُس کے چچا زاد بھائی نے مجھے آواز دی۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس لئے میں اُسے نہ دیکھ سکا۔ وہ اُٹھ کر باہر آ گیا۔ دو منٹ تک میں اُس کے پاس کھڑا رہا اور پھر یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے کسی آدمی کو تلاش کرنا ہے" چلا آیا حالانکہ آدمی مل چکا تھا۔ انسان کتنا مکّار اور دھوکے باز ہے۔

میں سوچنے لگا کہ یہ نہایت ہی بُرا ہوا۔ اُن کو میرے آنے کا پتہ نہیں چلنا چاہیئے تھا دراصل ہوا یوں کہ باہر جھلملاتے ہوئے فانوس کی کافی روشنی تھی اور ڈبوں کے اندر اندھیرا تھا۔ اُس لئے مجھے اس طرح سرگرداں دیکھ کر خود ہی آواز دے دی ورنہ مجھے اُن کا کبھی پتا بھی نہ چلتا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آ گئی اور ڈبے ساتھ لگا دیئے گئے۔ میری گاڑی کے ڈبے اب بھی اُداس کھڑے تھے۔ میں ڈبے کے عین سامنے مگر ذرا ہٹ کر جا کھڑا ہوا۔ وہاں بھائی کے علاوہ اُس کا والد بھی مجھ سے ملا۔ میں نے اُن کو سگریٹ پیش کیا جسے انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اُس کے والد نے مجھے بتایا کہ وہ حیدر آباد جا رہے ہیں۔ کیمپ کمانڈر کی نوکری ملی ہے۔ یہاں بھی وہ مہاجرین کیمپ کے کمانڈر تھے۔ غالباً تبدیلی ہوئی ہوگی۔ وہ میرے

سامنے گاڑی کے اندر بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی شاید غم و اندوہ کا سیلاب اُس کے اندر ایک ہی جگہ منجمد ہو گیا تھا۔ مُردہ سی مسکراہٹ بمشکل وہ لبوں تک لائی۔ پچکے ہوئے، مرجھائے مرجھائے سے گال، بال پریشان اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک طوفان بپا تھا۔

"انسان پھول سے بھی نازک مزاج ثابت
ہؤا ہے جس کی صدیوں سے اکٹھی کی ہوئی
بشاشت یوں چٹکیوں میں اُڑ جاتی ہے اور
اور پھر وہی بے رنگی، وہی بے کیفی۔"

ہم دونوں بالکل کوئی بات نہ کر سکے حالانکہ باتوں کے طوفان ہمارے اندر ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔ اُن کے ڈبے میں ایک قمقمہ روشن ہؤا۔ سبزی مائل روشنی میں وہ یونان کا مجسمہ دکھائی دینے لگی۔ اُبھری ہوئی چھاتیاں، گول مول شانے، بھری بھری رانیں۔ اُداسی کے باوجود اُس میں بلا کی دلآویزی، دلفریبی اور مسحور کُن خوبصورتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ انسانی حُسن نہیں ملکوتی حُسن ہے۔ گاڑی نے وِسل دی اور میں نے اس ملکوتی حُسن کو، اپنی بے کس رفیقہ کو ہزیمت خوردہ دنیا میں یوں چھوڑ دیا۔ یہ بھوت کالے مُنہ والا بھوت میری آرزوؤں کے ڈھیر کو اُٹھا لے گیا۔

"انسان بڑے بڑے دعوے کرتا ہے اور اپنے

آپ کو اشرف المخلوق کہتا ہے۔ بہادری کے
سینکڑوں کارنامے دہراتا ہے مگر ایسے موقعوں
پہ اُس کی ساری دلیری کافور ہو جاتی ہے۔"

ہم دونوں بُت بنے رہے۔ اپنے ہاتھوں کو ایک ہلکی سی جنبش تک نہ دے سکے۔ اُس کا والد بھاگ کر گاڑی میں جا سوار ہوا اور اس کا بھائی ہڑ بڑ میرا منہ تکتا رہا جو اپنے چچا کو گاڑی پہ چڑھانے کے لیئے آیا تھا اور جس نے وہیں واپس جانا تھا جہاں میں نے۔

گاڑی بہت جلد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور ہم اپنی اُس گاڑی کی طرف چل دیئے جسے ہمیں ایک اسٹیشن چھوڑ کر دوسرے اسٹیشن پہ چھوڑنا تھا۔ اُس کے بھائی کے اصرار پہ مجھے اُس کے ساتھ ہی بیٹھنا پڑا حالانکہ میں جان بچا کر نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ میرا رنگ زردی مائل ہو گیا جیسے کسی نے چہرے پہ ہلدی مل دی ہے۔ خوشی کا وقت بگولے کی طرح گزر گیا تھا۔ "کاش ایک بار پھر وہی وقت ہاتھ آ جائے"۔ میں نے سوچا مگر کبھی گیا وقت بھی ہاتھ آیا ہے؟

اُس نے پوچھا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

میں جو اپنے خیالات میں غوطہ زن تھا یکدم چونک پڑا۔

"جی"۔

"میں نے پوچھا تھا۔ آپ کونسے سمندر میں غرق ہیں۔ اُس کے لبوں پہ نمکین مسکراہٹ تھی۔ میرے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں

پر زبان پھیرنی شروع کر دی۔ اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا جیسے میری اس پھیکی مسکراہٹ نے اسے اور زیادہ شبہ میں ڈال دیا ہے۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا:۔

"کوئی خاص بات نہیں۔"

وہ بڑا سریع الفہم تھا ہنس دیا کہنے لگا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ میں نے جو کچھ سُنا ہے وہ آپ کو بھی سُنا دیتا ہوں مگر وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے بالکل ٹھیک جواب دینگے"

میں نے کہا "فرمائیے"۔ وہ کہنے لگا۔

"اگر آپ ٹھیک ٹھیک بتا دینگے تو میں بالکل بُرا نہ مانوں گا۔ باور کیجئے میرے نزدیک یہ قطعاً اظہارِ کبیدگی نہیں۔ میں نے ایسی باتوں کا کبھی بُرا نہیں مانا۔ میں اس مسئلے کا خود حامی ہوں۔" اُس نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچا اور کہنے لگا۔ "دیکھئے میری شادی میرے ماں باپ نے کی تھی۔ زندگی جہنّم بن کر رہ گئی ہے یہ الگ بات ہے کہ اُنگ پالنا ہی پڑتا ہے اور پھر میری بیوی تو ایک طرح سے میری بھتیجی بھی ہے۔ میں آپ کا مشکور ہونگا۔ مجھے تھوڑا بہت پتہ تو چل ہی گیا ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اور چھمیاں کے کچھ تعلقات ہیں؟"

میرا جسم کانپ اُٹھا اور منہ پر اسی ثانیہ کئی رنگ آئے اور کئی گئے۔ منہ میں تالا سا لگ گیا۔ اُس نے پھر کہا۔

"یہ وقت ظن و قیاس کا نہیں۔ آپ بے دھڑک کہہ دیجئے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں۔"

یہ ایسی بڑی بات نہیں تو اس سے بڑھ کر اور کونسی بات ہو سکتی ہے؟ مگر وہ کتنا بلند حوصلہ انسان تھا۔ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ اپنی تمام نفاست پسندیوں اور نزاکت مآبیوں کے علاوہ اپنے خیالات وجذبات کی ایک مرئی تصویر تھا۔ اور کوئی ہوتا تو چھرا گھونپ دیتا یا گلا کاٹ دیتا۔ کم از کم تیری ماں.... تیری بہن..... تو ضرور ہی سُناتا اور دھول دھپہ بھی ہو جاتا۔ میں نے سوچا اس کی صاف دِلی کا صاف دِلی سے جواب نہ دینا ایک موہوم، نزاون اور ناشائستہ حرکت ہے۔ "مجھے ضرور سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ سچ بولوں لیکن ہمارے خون میں ابھی یہ جذبہ کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے نامعلوم کہاں کہاں سے کئی طاقتیں اکٹھی کر کے لب کھولے اور صرف مُردہ سی مسکراہٹ کیساتھ مُردہ سی آواز میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔"

وہ چُپ ہو رہا۔ اُس کی خاموشی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ "تمہاری آنکھوں پر دھند لکے سچائی کی روشنی دیکھنا ہی نہیں چاہتے" اور میری نظریں پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود اُوپر کو نہ اُٹھ سکیں۔

گاڑی اسٹیشن پر رُکی اور ہم دونوں اُتر کر گھر کی جانب چل دیئے۔ کیچڑ میں پاؤں پھسل پھسل جا رہے تھے۔ ہماری چالوں میں ایک عجیب طرح کا اضمحلال تھا۔ اولے بند ہو گئے تھے موسلادھار بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔

انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی گئیں۔ مجھے اپنی روحانی قلبی واردات اور جذبات کے متعلق بہت کچھ کہنا تھا۔ میں چاہتا تھا اُسے ایک خط لکھوں اور دِل کی بھڑاس اچھی طرح نکالوں مگر خط کہاں لکھوں کوئی محلہ، کوئی گلی، کوئی مکان نمبر، کچھ بھی تو مجھے معلوم نہ تھا۔ میری فطری سوگواری نے زعفرانی غازہ میرے سیب ایسے چہرہ پہ مل کر زرد بنا دیا۔ عجیب کشمکش میں دِن گزر رہے تھے۔ اگر میں نے سوچ سمجھ کر قدم رکھے ہوتے میری زندگی کی پہاڑی یوں دُھندلاہٹوں کی گود میں نہ سو جاتی، زندگی یوں نہ اجیرن ہو جاتی ہنسی خوشی کا سوتا یوں نہ سوکھ جاتا۔

راکوں کو کئی دفعہ اُس کی بھابی کے پاس بھیجا۔ جاتی دفعہ وہ اپنی بھابی کو سب کچھ بتا گئی تھی۔ اس کی بھابی سے یہی جواب آتا رہا کہ ابھی کوئی خط نہیں آیا۔ یہ سُن کر مجھے سخت قلق ہوتا۔ یہ بات میرے دل پر بیحد شاق گزرتی جب کبھی اس کی بھابی مجھے دیکھتی ضرور مُسکرا اٹھتی۔ حالانکہ پہلے بہت کم ایسا ہوا تھا۔ اور یہ مُسکراہٹ مجھے یوں لگتی جیسے زہر میں بجھے ہوئے نشتر میں محسوس کرتا کہ وہ خواہ مخواہ میرا مذاق اڑاتی ہے۔ مجھے بڑا غصہ آتا کہ میرا مذاق اُڑانے کا آخر اسے کیا حق حاصل ہے۔ رفتہ رفتہ دنیا کی تلخ حقیقتیں مجھ پہ واضح کرتی گئیں کہ "زندہ رہنے کے لئے کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی بسر کرنے کی خو پیدا کرنا نہایت ضروری ہے"!

*

(ریڈیائی ڈرامہ)

بھدّی لڑکی

افراد

جاوید
پرویز
طارق
ظفر

بھدّی لڑکی

(ہلکے سُروں میں موسیقی جس میں رنج و الم کی لہریں اُبھریں) پرویز اُکھڑے اُکھڑے قدم اُٹھاتا ڈرائینگ روم میں آکر بیٹھ جاتا ہے (پرویز کے قدموں کی چاپ) خالی پیالی میں چمچ گھماتا ہے (پیالی کے ساتھ چمچ ٹکرانے کی آواز پیدا ہوتی ہے) اور ساتھ ہی آہستہ آہستہ گنگناتا ہے ؎

سلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

وہ اپنے ہی خیال میں محو زور زور سے چمچ گھمانا شروع کر دیتا ہے (یہاں پیالی کے ساتھ چمچ ٹکرانے کی آواز تیز ہو جاتی ہے) پیالی ٹوٹ جاتی ہے (پیالی ٹوٹنے کی آواز) اُسی لمحہ جاوید اندر داخل ہوتا ہے (جاوید کے قدموں کی چاپ)

جاوید ۔ یہ تم سر نیوڑھائے کیوں بیٹھے ہو؟ جیسے غم کے تھپیڑوں نے تمہیں بے بس کر دیا ہے ـــــــ ٹیلی پر کب سے میرا انتظار کر رہے ہو؟ یار میں ذرا

لیٹ ہو گیا آج۔

پرویز۔ (مضمحل حالت میں) میں بھی ابھی آیا ہوں۔ تم کچھ زیادہ لیٹ نہیں ہو۔

جاوید۔ ارے ۔ ارے ۔ ارے یہ کیا؟ تم نے پیالی کیوں توڑ دی؟ کیسی خوبصورت تھی، نازک سی رنگین جیسے تتلی، باریک جیسے حریری آنچل، کنارے جیسے یاقوتی لب ـــــــ تم نے آخر توڑ کیوں دی؟

پرویز۔ بال جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری جھلملاہٹ ـــــــ ارے تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ سمجھا۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں بھئی۔ سچ کہتا ہوں کوئی بات ہی نہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں ہی بھول میں تھی کتنا بیوقوف ہوں پیالی کے ساتھ بالوں کا کیا تعلق ہے ـــــــ مگر ہے۔

جاوید۔ تم بہک گئے ہو۔

پرویز۔ شاید...... بہک گیا ہونگا مگر اُس کے بالوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی جھلملاہٹ تھی اور ہونٹوں پر طلوع صبح جیسی مسکراہٹ اور.... اور

جاوید۔ پرویز!

پرویز۔ کچھ نہیں۔ تم مجھے یوں گھور گھور کر نہ دیکھو۔ تمہاری ہر نظر میرے لئے ایک موت کے برابر ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو پرویز میں بہک گیا ہوں ـــــــ ہاں تو تم کیا کہہ رہے ـــــــ شاید میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ارے ہاں یہی سوال میں نے اپنے آپ سے کیا تھا کہ میں نے ایسی اچھی پیالی کیوں توڑ دی۔ مگر

باقی خوبیاں جو تم نے گنوائی ہیں وہ میرے نزدیک خوبصورتی کا صحیح معیار نہیں۔

جاوید۔ ابھی اس کے متعلق بہترین تشریحات ہیں اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مثلاً...

پرویز۔ یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جا سکتے ہیں مگر میں کہہ یہ رہا ہوں کہ جسے تم —— تم ہی نہیں بلکہ عام لوگ حسن کا معیار سمجھتے ہیں وہ معیار سرے ہی سے غلط ہے۔ اس سے زیادہ صاف الفاظ میں تم مجھ سے یوں سن سکتے ہو کہ حسن کے متعلق آپ لوگوں کا نقطۂ نظر غلط ہے۔ حسن کچھ اور ہی شئے ہے۔

جاوید۔ یعنی

پرویز۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کا بھدا پن ہی اس کی خوبصورتی کا باعث ہو۔

جاوید۔ اررر ے یہ کیا؟ یہ فلسفہ میں نے تو آج تک نہیں پڑھا...... تم ہی اس کے موجد ہو گے؟

پرویز۔ تم موٹے دماغ کے آدمی ہو۔ یہ الجھے ہوئے نازک باریک پھیل جانیوالے تاروں کی گتھی تم ایسے نہیں سلجھا سکتے۔ اس لئے اس بحث —— اس جھنجھٹ میں مت پڑو۔

جاوید۔ (اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے) کسی فلاسفر کی اولاد، بھدا پن اور خوبصورتی دو متضاد چیزیں ہیں۔ تم کس فارمولے کے تحت بھدے پن کو خوبصورتی ثابت کرتے ہو؟ —— مجھے یاد آیا۔ میٹرک میں میرے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا

کرتا تھا۔ وہ "۵ = ۱۱۷" الجبرے کے فارمولے سے ثابت کیا کرتا تھا۔ کہیں تمہارے

پاس بھی کوئی ایسا ہی فارمولا تو نہیں ؟

پرویز۔ اس کی توضیح میں تمہیں زندہ مثال دے دیتا ہوں۔ مگر میں پوچھنا یہ چُوں کہ تم گھنٹے بھر سے پیالی کا رونا کیوں رو رہے ہو؟ اصل میں افسوس تو اس سیٹ کا کرنا چاہیئے جو اُس کے ٹُوٹنے کی وجہ سے بے کار ہو گیا۔

جاوید۔ تم اِس پیالی کی اہمیت کیوں گھٹاتے ہو؟ یہ سب اس پیالی کی وجہ ہی سے تو ہؤا یعنی سیٹ کا نامکمل ہو جانا یا بھونڈا نظر آنا۔

پرویز۔ اس لیئے کہ اس کی اہمیت سیٹ کی بدولت تھی۔ سیٹ نہ ہوتا تو یہ کچھُ بھی نہیں تھی۔ سچ پوچھو تو اس کا افسوس کیا ہی نہیں جا سکتا تھا ——— لغو تھا ——— ٹھیک ہے نا میری بات ؟

جاوید۔ تم تو یونہی بضد ہو۔ دیدہ دانستہ تین ٹانگوں کی رٹ لگا ئیو الا قصہ ہی ہُوا نا۔

پرویز۔ یہ پیالیوں کا کھیل تمہاری سمجھ میں نہیں آنے کا یار میرے ———

میز پر دو پیالیاں تھوڑے فاصلہ پر پڑی تھیں۔ کسی شے سے وہ لبالب بھر گئیں اور پھر وہ ایک دُوسرے کی سمت بڑھنے لگیں ——— بالکل قریب پہنچ گئیں ——— ٹکرا گئیں ——— پھر ٹکرائیں ——— پھر ٹکرائیں ——— ایک پیالی ٹوٹ گئی ——— وہ اپنے ساتھی کا منہ تکنے لگی ——— اُدر..... اُور......

جاوید۔ پھر بہک گئے۔ تمہیں آج ہے کیا مرض؟

پرویز۔ کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں ـــــ سنو میں تمہیں ایک شعر سناتا ہوں۔

(قدرا واضح الفاظ میں اور پہلے سے اُونچی آواز میں گنگناتا ہے)

سلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہُوئے سوال

ٹھیک۔ یاد آیا۔ یوں ہے۔ لو بھئی سُنو۔ بڑا اچھا شعر ہے پھر بھول جاؤنگا (گاتا ہے) آواز میں غم اور مایوسی ہے)

سلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہُوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

جاوید۔ یہ تمہاری آنکھوں میں نمی کیسی۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ تم بے حد آزردہ معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری وہ سوسن اور گلاب کی سی تازگی کیا ہوئی؟ مایوسی تمہارے چہرے سے ٹپک رہی ہے ـــــ میں تمہارے چہرے پر بے پناہ درد کی مبہم سی نقاب دیکھ رہا ہوں۔ دراصل تم پیالیوں کی اوٹ میں کوئی اور ہی گتھی سلجھانے کی کوشش میں ہو ـــــ بات کیا ہے؟

پرویز۔ میرے پاس ایک ہی سیٹ تھا اُس کی ایک پیالی ٹوٹ گئی۔ میرا سارا سیٹ غارت ہو گیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ پورے سیٹ ہی کو توڑ دوں۔ یہ دلوں کو آہیں بنا کر اُڑانا اور راتیں آنسوؤں کی صورت بہانا مجھے نہیں آتا۔

جاوید۔ عجیب احمقوں والی باتیں کر رہے ہو۔

پرویز۔ احمق تو ہوتے ہی عجیب ہیں اور یہ عجیب احمق کونسی قسم ہوئی؟

جاوید۔ (متانت سے) تم گفتگو کا رنگ بدلنے کی کوشش نہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ اتنا بدھو نہیں ہوں۔

پرویز۔ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے؟ میں یہ پوچھتا ہوں بے کار شے کو کیوں خواہ مخواہ سنبھال کے رکھا جائے؟

جاوید۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

پرویز۔ میری زندگی کا بھی ایک سیٹ تھا جس کے کنارے مدت سے ٹوٹ رہے تھے اس کے اندر دراڑیں پیدا ہو رہی تھیں۔ مگر یہ کہہ کر دِل کو تسلی دے لیتا تھا۔ کہ "سیٹ مکمل تو ہے نا" ——— ایک پیالی کچھ زیادہ ہی خستہ حالت میں تھی۔ آج صبح وہ ٹوٹ گئی اور میرا سیٹ بالکل بے کار ہو گیا۔ اب میں چاہتا ہوں سرے سے اس سارے سیٹ ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جاوید۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم خودکشی کے منصوبے باندھ رہے ہو۔

پرویز۔ ممکنات کی دُنیا میں کیا ممکن نہیں۔

جاوید۔ یہ نہایت گھٹیا حرکت ہے۔

پرویز۔ ہوگی ——— مگر یہ سُن لو میں بحث اور دلیلیں نہیں چاہتا اپنی مشکلات کا حل چاہتا ہوں۔

جاوید۔ یہ بُزدلی ہے۔ نامردی ہے۔

پرویز۔ میں تمہاری اس ہمدردی اور پیار سے تنگ آ کر دیواروں سے سر پھوڑ لونگا۔ خدا کے لیئے چپ ہو جاؤ (وقفہ) اور زیادہ تیز اور ترش لہجے میں) میں نصیحتیں نہیں چاہتا۔ اپنی مشکلات کا حل چاہتا ہوں سُنا؟ میری ایک ہی اُمید جو صبح کاذب کے ستارے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ اب ہمیشہ کے لیئے بجھ چکی ہے۔ ——

(یاس انگیز لہجے کے ساتھ) بتاؤ اس کے بعد بھی کسی کو جینے کا حق ہے؟

جاوید۔ (نرم لہجے میں) بات کیا ہے پرویز؟ جب تک پورے قصّہ کا پتہ نہ چلے کوئی اٹل قسم کا فیصلہ کر دینا حماقت ہے۔

پرویز۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ قصّہ یہ ہے کہ محبت مٹ چکی ہے۔ اب میں اُس کی باقی ماندہ تھکاوٹ کو بھی مٹا دینا چاہتا ہوں۔

جاوید۔ معلوم ہوتا ہے جناب نے کوئی عشق وشق کیا ہے۔ اس قسم کی واردات ایسے ہی کاموں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

پرویز۔ یار جی چاہتا ہے مجھے کوئی چوراہے میں ٹکٹکی سے باندھ دے اور...... اور...... کچھ نہیں۔ (وقفہ)

پرویز۔ عشق کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں سب سے گھٹیا اُس سے اعلیٰ اس سے بھی اعلیٰ لیکن میرا عشق نہایت ہی ارفع و اعلیٰ قسم کا تھا۔ یوں تو جیسا کہ تم جانتے ہو میں نسیم سے بھی محبت کر چکا ہوں۔

جاوید۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے تب بھی تم کہا کرتے تھے "جاوید تم کیا جانو۔ سچ کہتا ہوں

مجھے نسیم سے بے پناہ محبت ہے کبھی نہ مٹنے والی لیکن جب وہ چلی گئی تو تم زخمی آہیں بھرا کرتے تھے اور پھر ایک دفعہ تم نے کہا تھا "جاوید میری حالت بالکل صنوبر کے درخت کی سی ہو گئی ہے۔ جانتے ہو صنوبر کتنا تاریک اور اداس درخت ہے؟" (طنزیہ) اور اب جناب کو یاد بھی ہے کہ ان بہار کے دنوں کی صبح کو کوئی نسیم بھی چلا کرتی تھی۔

پرویز۔ اس وقت میں یہی سمجھتا تھا۔ وقت کا ساتھ دینا ہی تریں مصلحت ہے۔

جاوید۔ دورنگی چھوڑ دو۔

پرویز۔ مگر تم بھولتے ہو میں نے نسیم سے کوئی دغا فریب نہیں کیا تھا۔ البتہ اس نے......

جاوید۔ (جلدی سے) تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ جاتی دفعہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں خط لکھے گی مگر یہ ایفا نہ ہوا۔

پرویز۔ اس لیے کہ اس نے وہاں ایک نیا شکار تلاش کر لیا ہوگا۔

جاوید۔ اتنی جلد ایسے بہتان۔ خدایا پناہ پہلے تو تم تعریفوں کے پل باندھا کرتے تھے؟

پرویز۔ (اسی جذبہ میں زہر اگلتے ہوئے) یہاں بھی اس کا تعلق انور سے رہ چکا تھا۔ جب یہ بھید کھل گیا اور اس کے راستے میں کانٹے ہی کانٹے بچھ گئے تو اس کا رخ میری طرف ہو گیا۔

جاوید۔ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے جھک کیوں ماری؟

پرویز۔ انسان سے ہمیشہ غلطیاں ہوا کرتی ہیں اتنی سی بات کے جرم میں کسی کو چوپایوں میں داخل کر دینا سخت حماقت ہے۔

جاوید۔ تم بھی عجیب جانور ہو۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر ——— رشیدہ کو کیوں چھوڑ دیا تھا، اُس وقت بھی تو تمہاری رُوح میں لامتناہی محبت کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔

پرویز۔ اُس میں تو ہم دونوں کا بالکل کوئی قصور نہیں۔ اُس کی ماں ہمارے درمیان آہنی دیوار بن گئی۔

جاوید۔ تو محبت ختم ہو گئی ؟

پرویز۔ (اُس کی بات پر دھیان نہیں دیتا) رشیدہ کا باپ فوت ہو گیا تھوڑا بہت جو پنشن کا سلسلہ تھا بند ہو گیا۔ نچلے متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ آمدنی کا ذریعہ جاتا رہا کسی کے مرنے سے خرچ تھوڑے رُک جاتے ہیں۔ مجبوراً بچاری کو......

جاوید۔ رشیدہ سے پیشہ کروانا پڑا۔ وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے (طنزیہ) رہنے دو۔ یہ طوطے مینا کی کہانی (آواز میں تیزی آ جاتی ہے) میں پوچھتا ہوں اِن باتوں سے محبت ختم ہو جاتی ہے (وقفہ نرم لہجے میں جس میں تلخی ہو) اچھا وہ سنتوش کماری؟ تمہیں یاد بھی ہے کہ تمہاری زندگی میں یہ حادثے بھی گزرے ہیں ؟

پرویز۔ خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ۔

جاوید۔ اُس وقت جانتے ہو تُم کیا کہا کرتے تھے۔ "جاوید میری کشتیٔ حیات جو غم کے تیز دھارے پر بہتی ہوئی چلی آ رہی تھی اب ہیبتناک مصیبتوں اور دُکھوں کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہے۔"

پرویز۔ جب وہ کہیں چلی گئی تو میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا (غصہ میں آ جاتا ہے)

دنیا کی تمام لعنتیں اور تمام عقوبتیں مجھ پر نازل ہوں اگر میں نے ذرا بھی جھوٹ بولا ہو۔

جاوید۔ (اپنے مخصوص رویہ سے) اس لیئے تم بھول گئے...... یہ وہی ہے جس سے تم کہا کرتے تھے "اُس نے میری تمام آسائشوں اور راحتوں کو اپنی ہستی میں سمیٹ لیا ہے"!

پرویز۔ یہ ٹھیک تھا۔

جاوید۔ اور اب آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ آجکل کی محبت کس قدر گر گئی ہے۔

پرویز۔ تم تو یونہی دماغ چاٹ رہے ہو بھلے آدمی ایک چیز جو سامنے نہیں اور مدت سے نہیں تو وہ بھولے ہی گی۔

جاوید بس کرو۔ اب میں سب کچھ جان چکا ہوں (وقفہ) یار تم گایا کرتے تھے ایک شعر کیا تھا وہ؟ یاد نہیں آرہا۔ بھلا سا شعر تھا۔ ارے ہاں...... ہاں...... یاد آیا (گاتا ہے) ؎

کونسی رات آن ملیئے گا　　　　دن بہت انتظار میں گزرے

واہ بھئی واہ کیا شعر کہا ہے کسی نے۔ دھڑن تختہ کر دیا ہے (اُسے مذاق کرتا ہے) ایسا اچھا شعر تم نے گنگنانا چھوڑ دیا۔ بڑے تیرہ بخت انسان ہو۔

پرویز۔ تم کچھ بھی نہیں جان سکے یقین جانو آج بھی میرے سامنے ان میں سے کوئی بھی ہو میں اُن سے اُسی طرح محبت کرنے لگونگا۔ اور سُنو زیادہ طنز کرنے کی کوشش نہ کرو...... خود ہی بیوقوف بن رہے ہو۔

جاوید۔ گویا تم ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور۔

پرویز۔ یہ غلط ہے تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔ اللہ قسم جب اُن کی یاد آتی ہے تو بے طرح ستاتی ہے۔

جاوید۔ (ہنستا ہے) ہی ہی ہی ہی۔ اسی لئے ہر چوتھے دن محبت کا ایک نیا ڈھونگ رچا لیتے ہو۔ —— اس دنیا میں مرد خارش زدہ کُتے اور عورتیں چچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں۔

پرویز۔ (سخت غصہ میں اونچی آواز میں) جاوید!

(گھنٹی کی آواز۔ نوکر باہر نکلتا ہے۔ طارق نوکر سے پوچھتا ہے "کوئی اندر ہے؟" وہ کہتا ہے۔ جاوید صاحب اور پرویز صاحب اندر ہیں۔ طارق داخل ہوتا ہے۔ پاؤں کی چاپ (یہ سب بیک گراؤنڈ میں ہو)۔

طارق۔ کیا ہو رہا ہے بھائی۔

جاوید (طنزیہ) ارفع و اعلیٰ محبت کی سنہری تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

طارق۔ (پرویز سے) تمہاری نئی کہانی ابھی ادھوری ہی ہے یا مکمل ہو چکی۔

پرویز۔ عنقریب ہو جائے گی۔ (گنگناتا ہے) ؎

لیجئے سُنیئے اب افسانۂ فرقت مجھ سے
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

جاوید۔ خوب۔ اچھا شعر ہے۔

پرویز۔ یہ شعر میری مکمل کہانی ہے۔

طارق۔ بھئی اس کی باتیں خوب مزے کی ہوتی ہیں تمہارے جانے کے بعد میں تخلیئے میں اُنہیں دُہرا دُہرا حظ اُٹھاتا رہا ——— (وقفہ) ارے کیا کہا تھا تم نے یہ شعر تمہاری مکمل کہانی ہے؟

(شعر کو ترنم سے سُناتا ہے) ے

لیجئے سُنئے اب افسانۂ فرقت مجھ سے
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

بھئی واہ..... واہ..... واکیا شعر ہے۔ لُطف آگیا۔ میں بھی یہ شعر گنگنایا کرونگا۔ مگر نہیں، یہ دوسرا مصرعہ میرے منہ سے پھبے گا نہیں۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیئے۔

پرویز۔ اب تم بہت جلد پورا لُطف حاصل کر سکوگے (وقفہ) دیکھو چاند محبت کی سوچ میں چُپ چاپ گُم ہوگیا ہے۔

جاوید۔ پاگل ہو گئے ہو یا اندھے؟ اس وقت دن ہے رات نہیں۔

پرویز۔ تمہاری نظر بالکل کمزور ہو چکی ہے۔ دبیز شیشوں کی عینک لگواؤ۔

طارق۔ (اپنی ہی دُھن میں) یار اس کے باوجود مجھے اُس کی باتوں سے خلوص ٹپکتا نظر آیا ——— یار میرے تمہاری اُس بات پر مجھے خوب ہنسی آئی۔ تم بھی ایک ہی بیوقوف ہو۔ جاوید سُنا تم نے اس نے اس سے کیا کہا تھا۔

جاوید ۔ کوئی لغو واہیات بات ہی کہی ہوگی۔

طارق ۔ (ہنستا ہے) کمبخت اُس سے کہتا ہے۔ ”کشور جان بقول تمہارے ہماری شادی اس لیئے نہ ہو سکے گی کہ ہماری باگ ڈور دُوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اپنے بچوں کے تو ہم خود مختار ہونگے نا؟ یعنی اُن کے حقوق کا ٹھیکہ تو ہمارے ہی پاس ہوگا؟“

جاوید ۔ اُس نے کیا کہا؟

طارق ۔ اُس نے کیا کہنا تھا۔ کہنے لگی۔ ”ہم خود مختار ہونگے۔ پکے نہیں تو عارضی ٹھیکیدار تو ضرور ہونگے۔ عارضی اس لیئے کہ ہمارے سارے بزرگ اس وقت مریں گے نہیں اور جب تک وہ مریں گے نہیں ہماری ترقی نہیں ہو سکتی یعنی ہم پکّے ٹھیکیدار نہیں ہو سکتے۔“

جاوید ۔ لڑکی سیانی معلوم ہوتی ہے۔

طارق ۔ ہاں اور دیکھا تم نے۔ اس بات میں کس قدر تلخی ہے۔

طارق ۔ تو یہ چُغد اُس سے کہتا ہے۔ ”تم اپنی لڑکی کی شادی میرے لڑکے سے کر دینا۔“

جاوید ۔ ہاہاہا ——— ہاہاہا ——— ہا

طارق ۔ اس سے بھلا کیا ہوگا؟

جاوید ۔ تم کہتے تھے نا ”لوگ سیانے ہوتے جا رہے ہیں اس لیئے پاگلوں کی کمی ہو گئی ہے۔ گورنمنٹ سوچ رہی ہے کہ اب پاگل خانوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان کی بجائے کیوں نہ ہسپتال کھول دیئے جائیں“۔ میں یہ کہتا ہوں۔ گورنمنٹ کو

پہلے سے دُگنے پاگل خانے تیار کرانے چاہئیں۔

پرویز۔ میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ اگر گورنمنٹ ایسا نہ کریگی تو تمہارے ایسے لوگوں کا کیا ہو گا؟

طارق۔ اچھا یہ تو بتاؤ اس میں کیا مصلحت تھی؟

پرویز۔ میں اِن گھسی پٹی رسُوم کی آہنی زنجیروں کی ایک ایک کڑی توڑ کر دُور پھینک دینا چاہتا ہُوں۔

جاوید۔ کیا مطلب؟

پرویز۔ وہی پُرانا رونا تھا۔ فلاں جاٹ ہے۔ فلاں راجپوت ہے فلاں یہ ہے فلاں وہ ہے۔ یہ سب گدھے ہیں۔ یہاں بالکل آزادی ہونی چاہیئے۔

جاوید۔ آزادی! —— ہاہاہا۔ مسٹر فارن کنٹریہ کی طرف دیکھو۔ خُون کے آنسُو رو رہے ہیں مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا —— ان ہی سے کچھ سیکھو۔ اپنی موت یاد نہیں تو دوسروں کو مرتے دیکھ کر ہی ......

پرویز۔ جاوید! تم ہمیشہ گدھے رہو گے میں لکھے دیتا ہُوں۔

(گھنٹی کی آواز)

طارق۔ (کافی اُونچی آواز میں) آجاؤ یار کیا کان کھا رہے ہو۔

(ظفر داخل ہوتا ہے پاؤں کی چاپ)

ظفر۔ پروگرام کے مطابق ہم لوگوں کو آج شکار جانا ہے۔ اور تم ابھی تک پھسکڑہ

مارے بیٹھے ہو۔ مینا کے بیٹے جلد اُٹھو ــــــ ارے تم لوگوں کی چائے ٹھنڈی ہو چکی اور تم........

پرویز۔ بھئی میں تو نہیں جاؤنگا۔

ظفر۔ کیوں ؟

جاوید۔ انہیں آج اپنی ادھوری کہانی مکمل کرنا ہے۔

ظفر۔ (مصنوعی ٹھنڈی لمبی آہ بھرتے ہُوئے) میں بدنصیب ہی اس معاملے میں پھسڈی واقع ہؤا ہوں۔ یار مجھے بھی بتا دو تمہارے پاس کونسا تیر بہدف ٹوٹکا ہے۔

طارق۔ ظفری! اب ذرا اپنی بکواس بند کرو۔ اس کی کہانی سُن لیں (پرویز سے) شروع کیجئے بے مُلک شہزادے۔

پرویز۔ (مایوسی اور غصہ سے) تم میری تضحیک کر رہے ہو ــــــ تم لوگ حد سے بڑھ رہے ہو۔

ظفر۔ ٹل جاؤ بھئی ٹل جاؤ اس کے مزاج کا پارہ تو بیرومیٹر کے آخری ہندسے تک پہنچ گیا ہے (وقفہ)

ظفر۔ تمہیں آج کیا بیماری لگ گئی ہے۔ میرے یار اتنا غصہ۔ چ چ چ۔ غصہ تھوک دو بیٹے۔ زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔

طارق۔ تم چُپ رہو جی۔ دیکھو میں اسے دو منٹ میں رام کرتا ہُوں۔ کیوں بھئی...

جاوید۔ ہم حد سے بڑھ رہے ہیں۔ ہُوں۔ تو پھر ہماری قمیص پھاڑ ڈالو۔

(سب ہنستے ہیں)

پرویز۔ (طارق سے) کیوں میاں صاحب ضرورت ہے نا نئے پاگل خانے کھولنے کی۔

طارق۔ بیشک اچھا اب میری طرف دھیان دو۔ کہانی شروع میں کئے دیتا ہوں۔ مکمل تم کر دینا۔ ہوں ———— ایک لڑکی تمہارے محلے میں مدت سے رہ رہی تھی مگر تم نے اُسے کبھی پیار بھری نظروں سے نہ دیکھا تھا۔

ظفر۔ اِس لئے کہ وہ نہائیت ہی بھدی لڑکی تھی۔ اُس کے جسم کا ہر عضو سپاٹ تھا ———— سپاٹ جیسے اُونٹ کے تلوے اور یہ ایسی خوبصورتی کی تلاش میں تھا جو مدت سے اسے نظر نہ آ رہی تھی۔

جاوید۔ تو تمہیں بھی اس قصّے کا پتہ ہے؟

ظفر۔ زیادہ نہیں جانتا۔ دیکھو کہاں تک ساتھ دیتا ہوں۔

جاوید۔ مگر کہانی میکر خود تو ابھی تک خاموش ہے۔

پرویز۔ ہاں مجھے خود ہی شروع کرنا پڑے گی اور خود ہی ختم۔ تم میں سے کوئی بھی میرا ساتھ نہ دے سکے گا۔

طارق۔ جی

ظفر۔ ارشاد۔

پرویز۔ میں بے کار تھا جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو۔

طارق۔ بالکل بالکل۔

پرویز۔ میں بیٹھ کر تھک گیا تھا بلکہ تنگ آگیا تھا۔

جاوید۔ (ہنستا ہے) اس لیئے جناب کھڑا ہونا چاہتے تھے۔

پرویز۔ (اَن سُنی کرتے ہوئے) ایک دن جانے کونسے جذبے نے مجھے اُکسایا کہ کچھ ہونا چاہیئے۔ کچھ ہو۔ کچھ بھی نہ ہو تو زمین پر زور زور سے ٹانگیں مارنا ہی شروع کر دوں۔

ظفر۔ یعنی۔

پرویز۔ کہا جو ہے میں نے کچھ بھی ہو مگر کچھ ہونا چاہیئے۔

ظفر۔ خُوب۔

جاوید۔ تو جناب نے عشق کی ٹھانی۔

پرویز۔ جی اِس لیئے کہ یہ غمِ روزگار تک کو بھلا دیتا ہے۔

ظفر۔ بھئی بات تو پتے کی کہی ہے تم نے۔

طارق۔ مگر تم تو ایسی خوبصورتی چاہتے تھے جو اشعار میں ہے اور نہ کسی ناول میں۔

پرویز۔ یہ ٹھیک ہے مگر دل لگی تو کسی سے بھی کی جا سکتی ہے۔

طارق۔ گویا تم نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ اسے دل بہلاوے کا سامان بنایا جائے۔

پرویز۔ ہاں مگر بعد میں ایسا نہ ہوا۔

ظفر۔ کیا مطلب؟

پرویز۔ ہنسی میں پھنسی ہو گئی۔ جس سے دل لگی کی تھی اور خیال تک نہیں تھا کہ اس سے......

جاوید۔ محبت ہو جائیگی۔

پرویز۔ جی۔

ظفر۔ اور تمہارا خوبصورتی کا معیار کیا ہؤا؟

پرویز۔ خوبصورتی کا کوئی معیار نہیں۔ اِسے تولنے یا ماپنے والا کوئی پیمانہ نہیں۔

طارق۔ یہ بھی خوب کہی۔

ظفر۔ جی۔

جاوید۔ یہی بکواس تم لوگوں کے آنے سے پہلے یہ میرے ساتھ کرتا رہا ہے۔

ظفر۔ خوبصورتی کی کوئی تعریف؟

پرویز۔ جو دل کو بھا جائے وہ شے خوبصورت ہے ——— جو دِل کو موہ لے اور بس۔

ظفر۔ اس کے علاوہ کچھ بھی خوبصورت نہیں؟

پرویز۔ بالکل۔

جاوید۔ ایک شے نہائیت ہی خوبصورت ہے سب اُسے پسند کرتے ہیں مگر تمہیں وہ پسند نہیں تو وہ بھدّی ہو گئی۔

پرویز۔ ہاں۔ میرے لئے بھدّی سے زیادہ کچھ نہیں۔

ظفر۔ خُوب۔

طارق۔ خوب۔

جاوید۔ میرا برادرانہ مشورہ ہے کہ تم مینٹل ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔

پرویز۔ یہ کوئی ٹھوس دلیل ہے اور نہ میرے سوال کا جواب۔

ظفر۔ چھوڑو اس کو یہ بتاؤ، شروع میں یعنی جب ابتدا ہوئی تمہارے لئے وہ بدصورت ہی تھی نا؟

پرویز۔ ہاں۔

ظفر۔ تو کونسی کشش نے تمہیں اس کی طرف مائل کیا؟

جاوید۔ اب سرکار پھنسی (ظفر سے) یار میرے تم نے بہت ٹیڑھا سوال کر دیا۔

پرویز۔ اس وقت اس میں صرف ایک دلکشی تھی ——— مگر نہایت اعلیٰ۔

جاوید۔ کیا؟

ظفر۔ وہ کیا؟

پرویز۔ وہ ایک بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔

جاوید۔ بہت بڑا کتنا؟ زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ کا ہوگا۔

(سب ہنستے ہیں)

طارق۔ تمہارا مطلب امیر باپ سے ہے نا؟

پرویز۔ جی۔

طارق۔ وہ مارا۔ اب یہ تیر بہدف ٹوٹکا مجھے بھی سیکھنا پڑے گا۔ بھئی اباجی روز روز پیسے نہیں دیتے۔

ظفر۔ یہ تم سب کو ماننا پڑے گا کہ اسے سُوجھتی دُور کی ہے۔

جاوید۔ یہ سب ہوا کیسے؟

پرویز۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھی ایک دن جبکہ وہ صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں راستے میں جا کھڑا ہوا۔

طارق۔ گھر کے لوگ کدھر تھے؟

پرویز۔ پرلی طرف۔

ظفر۔ پھر کیا ہوا؟

پرویز۔ میرے قریب سے گزری تو میں نے کہا۔ "کشور" جواب ملا "جی"۔ بھئی اس کی اس "جی" میں ایک عجیب ہی مٹھاس تھی جیسے کسی گدگدے سینے کے زیر و بم میں یا جیسے.........

طارق۔ شاعری چھوڑو۔۔۔۔۔۔۔ پھر؟

پرویز۔ میں نے کہا ذرا بات تو سُنو۔ بس اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اُس نے متوحش نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بغیر کوئی جواب دیئے پرلی طرف بھاگ گئی۔ مجھے آج بھی اُس کے چہرے پر اُڑتی ہوئی ہوائیاں یاد ہیں اور اُس "جی" کی حلاوت آج بھی میرے دل میں موجود ہے۔

طارق۔ تم گھبرا گئے ہو گے؟

پرویز۔ نہیں خفیف سا خوف ضرور آیا مگر میں نے کئی بہانے پہلے ہی سے گھڑ

رکھے تھے۔ پھر کوئی اُس سے مذاق تھوڑا ہی کیا تھا جو وہ شکایت کرتی۔ بتاؤ وہ کسی سے کہتی تو کیا کہتی ؟

ظفر۔ پھر یہ سلسلہ کیسے شروع ہو گیا ؟

پرویز۔ شام کو جب میں گلی میں پتنگ کاٹ رہا تھا تو جنابہ کھڑکی کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔

طارق۔ اُسے تمہاری کونسی بات پسند آگئی ؟

ظفر۔ (طارق سے) یہ خود بھی تو رئیس کا لڑکا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ صبح صبح روز۔۔ انگریزی کے اخبار میں سب سے پہلے "ضرورت ہے" کے کالم پڑھتا ہے۔

(دو آدمیوں کے ہنسنے کی آواز)

پرویز۔ بعد ازاں میں نے اُسے پوچھا تھا۔ کہ "تم تو مجھے پسند آ ہی گئی تھیں مگر مجھ میں کونسی خوبی تمہیں نظر آئی ؟

طارق۔ کیا جواب ملا ؟

پرویز۔ ہنس دی۔ کہنے لگی۔ "مجھے کیا پتہ" میں نے پوچھا۔ "تم نے اس وقت مجھے کوئی جواب کیوں نہ دیا ؟" کہنے لگی۔ "آپ کی اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ آئندہ کبھی آپ کے گھر نہ جاؤنگی۔ مگر پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا۔"

ظفر۔ تمہارا مقصد پورا ہو گیا ؟

پرویز۔ ہاں۔ پہلے میں نے اُس سے معمولی سی رقم مانگی جو مجھے مل گئی۔ چند دنوں کے بعد میں نے ایک بھاری رقم کا مطالبہ کر دیا۔ تھوڑی بہت کوشش کے بعد وہ بھی مجھے مل گئی مگر اُس پہ بڑا ہنگامہ ہوا۔

ظفر۔ کیسے ؟

پرویز۔ اُنہوں نے سمجھا چوری ہو گئی۔ پولیس میں رپورٹ درج کروا دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد ایک عادی مجرم پکڑا گیا۔ یہ چوری بھی اُسی سے منسوب کر دی گئی اور تھانے دار صاحب کی ترقی بھی ہو گئی۔

جاوید۔ چوری ——— کیا مطلب۔ یہ رقم اُس نے خود تمہیں نہ دی تھی ؟

پرویز۔ بتا تو رہا ہوں مگر گھر والوں نے یہی سمجھا نا۔ اب اُس نے اُنہیں بتانا تھوڑا تھا۔

ظفر۔ بھئی خوب۔

پرویز۔ مگر میرے پاس وہ رقم ویسے ہی رکھی رہی جو میں نے کافی عرصہ کے بعد ایک چال سے واپس کر دی کیونکہ ویسے وہ لینے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔

ظفر۔ واپس کیوں کر دی ؟

پرویز۔ یہ شرافت سے بعید تھا۔

طارق۔ اور سن لو جیسے ستیہ وادی ہرلش چندرا وتار بس یہی ہے۔ میں ہوتا تو رقم کو ایسا ٹھکانے لگاتا.........

پرویز۔ اینٹھی تو میں نے بھی ٹھکانے لگانے کے لئے ہی تھی مگر اُس کے اخلاص سے میں اپنی سب شاطرانہ چالیں بھول گیا۔

ظفر۔ معلوم ہوتا ہے تم اس سے بہت زیادہ متاثر ہو۔

پرویز۔ متاثر؟ یقین جانو جس حسن کی تلاش میں میں مدت سے سرگرداں تھا وہ بلکہ اُس سے بھی کچھ زیادہ ہی میں نے اُس میں دیکھا۔ جہاں ایسا حُسن ایسا اخلاص ہو وہاں دِل نہ پگھلے گا تو کہاں پگھلے گا؟

ظفر۔ اچھا پھر؟

پرویز۔ پھر کیا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ میرے ساتھ شادی کرلے۔

طارق۔ تو اُس نے منظور کر لی؟

پرویز۔ پھر اب تک کہانی ختم نہ ہو چکی ہوتی؟

ظفر۔ کیا جواب دیا اُس نے؟

پرویز۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ کہنے لگی۔ بہت مشکل ہے۔" میں نے پوچھا۔ کیوں، کہنے لگی آپ راجپوت ہیں ہم جاٹ ہیں" جاٹ اپنی لڑکی سوائے جاٹوں کے کسی کو نہیں دیتے۔"

ظفر۔ کیوں؟

پرویز۔ بس مرضی اُن کی۔

جاوید۔ وہ بھی پرویز کی طرح موٹی عقل کے آدمی ہوتے ہیں نا۔

ظفر۔ پھر؟

پرویز۔ میں نے اس سے کہا یہ سب بکواس ہوتی ہے۔ کہنے لگی: "یہ تو میں بھی مانتی ہوں مگر مجبوری ہے۔"

طارق۔ مجبوری کس بات کی؟

پرویز۔ اُسے اپنے باپ سے بے حد محبت تھی وہ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔

جاوید۔ تو تمہاری محبت پر اُس نے اپنے باپ کی محبت کو ترجیح دی؟

پرویز۔ یہی بات میں نے اُس سے کہی تھی اس کے جواب میں وہ میری آغوش میں سر رکھ کر گھنٹوں روئی تھی۔

طارق۔ پھر کیا ہوا؟

پرویز۔ پھر اُس کی شادی ہو گئی لیکن اُس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے اُسی طرح ملتی رہیگی۔ ہماری محبت میں بال برابر بھی فرق نہیں آئے گا۔

ظفر۔ تو یہ کہاں تک ٹھیک نکلا؟

پرویز۔ اُس کی طرف سے سو فیصد ٹھیک۔

طارق۔ خوب۔

ظفر۔ (حیرانی سے) اچھا!!!

جاوید۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

پرویز۔ میں بھی یہی سمجھتا رہا مگر جب ہو گیا تب مجھے پتہ چلا۔

ظفر۔ کیا مطلب؟

پرویز۔ وہ مجھ سے ویسے ہی محبت کرتی رہی اُس کے ایثار و خلوص میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا۔ "لڑکی زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اگر دُوسری بار وہ کسی سے محبت کرے تو اُس محبت میں پہلا سا کنوارا خلوص نہیں آسکتا۔

ظفر۔ لڑکی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔

پرویز۔ (اُسی دُھن میں) مگر میں اُس سے پہلی سی محبت نہ کر سکا۔ اس بات کا اُس نے مجھ سے کبھی گلہ نہ کیا اور نہ میں نے ہی پروا کی بگروہ گھُٹی گھُٹی رہنے لگی۔ گالوں کی لالی سرسوں کے پھُولوں کی طرح زرد ہو گئی۔

ظفر۔ پھر؟

پرویز۔ پھر آسمان نے اپنے چنگل بڑھا دیئے، اُس کی زرد لاش تمام آرزوئیں لئے منجمد ہو گئی اور اب اُس کی ناشاد رُوح میرے کانوں میں سائیں سائیں کر رہی ہے۔ میں بہُت جلد اُس کے ساتھ بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتا ہُوں۔ اِن پستیوں سے میرا جی اُکتا چکا ہے۔ دیکھو ——— وہ کتنی بلندیوں میں پرواز کر رہی ہے۔

جاوید۔ جانتے ہو اب یہ کیا کرنا چاہتا ہے (ترش لہجے میں) خودکُشی۔

ظفر - خودکشی؟

طارق - خودکشی؟

پرویز - ہاں - دیکھتے نہیں ہو ہوائیں اُداسیوں سے بوجھل ہو چکی ہیں - مجھے یہاں گھٹن محسوس ہو رہی ہے - ـــــــ یہاں کی فضا مجھے کاٹے کھا رہی ہے کہیں سے میرے کانوں میں ڈراؤنی چیخوں کی آواز آ رہی ہے - دیواریں مجھے نگل جانا چاہتی ہیں - دیکھو ـــــــ یہ آواز سُنو ـــــــ ـــــــ جیسے بلیوں نے لوٹ لگا کر اُداس اُداس آوازیں نکالنا شروع کر دی ہوں - یہ کیا ہے؟ ـــــــ یہ ـــــــ یہ ـــــــ یہ ـــــــ جیسے ارواح خبیثہ تیز تیز لمبے دانت نکالے ڈراؤنا ناچ ناچتے ہوئے میری طرف بڑھ رہی ہوں -

ظفر - دیوانے مت بنو -

طارق - پاگل ہو گئے ہو - ہوش میں آؤ -

جاوید - عقل کے ناخن لو -

پرویز - وہ دیکھو، وہ میرا راستہ تک رہی ہے - اُس کی ہر نظر میرے لئے ایک قیامت کے برابر ہے - اُس کے زرد چہرے پہ فریاد تڑپ رہی ہے - اُسکے نیلے ہونٹ مجھے آوازیں دے دے کر تھک گئے ہیں - اُس کی آنکھیں ابھی تک کسی کی آس میں جوت جگائے ہوئے ہیں -

ظفر۔ (غصّے سے) پرویز بیوقوف مت بنو۔

طارق۔ اتنے عقلمند سمجھدار ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو ——— ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

پرویز۔ (چیں بجبیں ہو کر) ہاہاہا ——— ہاہاہا ——— ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ کسی کی رُوح میرے لئے تڑپ رہی ہو اور میں یہاں گلچھڑے اُڑاتا پھروں ——— ہاہاہا ——— ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

(قدموں کی چاپ)

ظفر۔ (کسی قدر برافروختہ ہو کر) ذرا ٹھہرو۔ کہاں چلے ؟

جاوید۔ (سخت غصّہ سے) پرویز۔

طارق۔ پرویز۔

پرویز۔ اب زندگی کی آخری رمق بھی مٹ چکی ہے۔ وہ دیکھو میری ناشاد رُوح مجھے بلا رہی ہے۔ تم میرے تابُوت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکو گے۔ یہ میرا نہیں میری تمنّاؤں کا تابُوت ہے۔ ارمانوں کا جنازہ، حسرتوں کا مدفن۔

ظفر۔ (فہمائش آمیز متانت سے) ذرا صبر تو کرو !

پرویز۔ بہت کر چکا۔ آج اس سہمی ہُوئی محبت کا تمہیں بھی غم کھانا ہوگا۔ دیکھو چاند نے بھی غم کے مارے گیروے بادلوں سے منہ ڈھانپ لیا ہے۔ اور سُنو۔ یہ بے جان دلیلیں اور خالی خولی بحث اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ مجھے ایسے نشتر

کی ضرورت ہے جو حقیقت کا پیٹ چاک کر سکے۔

جاوید۔ پرویز۔

طارق۔ پرویز۔

ظفر۔ ٹھہرو۔

پرویز۔ تم اپنے دوست سے ناانصافی کر رہے ہو۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا تم اُسے بھی یہی جواب دیتے؟ یہی کہتے؟ تم سب ذہین اور طباع لوگ ہو۔ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر مجھے جواب دو — بولو — بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو گئے ہو۔

(قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ دُور ہو رہی ہے)

ظفر۔ (پریشانی کے عالم میں) پرویز تم ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

جاوید۔ پرویز! یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

طارق۔ (سراسیمہ ہو کر) پرویز بیوقوف نہ بنو۔

(سب اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ تین آدمیوں کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ دُور ہو جاتی ہے)

چاندنی اور زنجیریں

چاندنی!

پھیکی پڑ رہی تھی

زنجیریں!

پھیل رہی تھیں

کبھی کبھی دونوں اس طرح اُبھرتیں کہ آپس میں اُلجھ جاتیں۔

چاندنی اور زنجیریں دو متضاد چیزیں جب ایک دُوسرے میں زبردستی گھس جائیں تو ایک عجیب سا امتزاج پیدا کر دیتی ہیں۔ اِس عجیب سے امتزاج نے ایک عجیب سی صُورت اختیار کر لی۔

زنجنا!؟ "چاندنی"، "ایک مہکتی ہُوئی کلی"، "ایک فانوس"، "ایک شگوفہ" "کارمن میرانڈا کے گالوں کی طرح کا" "ایک عجیب سا لچکدار گیت"۔

چاندنی کی طرح بہتے ہُوئے گیت کی آواز سیاہ ڈراؤنے دبیز اندھیرے کے نیچے دب رہی تھی۔ آہنی ڈھیٹ قسم کی زنجیریں اُس کے گرد لپٹتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ ابھی تک خاموش تھی جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ خاموشی دم سادھے بیٹھی تھی اور سامنے ایک دہشتناک درندہ اُس کی طرف ڈراؤنا بھیانک ناچ ناچتا بڑھتا چلا

آرہا تھا۔ غم کا ایک خوفناک طوفان تھا جو اُسے عنقریب بہالے جانے والا تھا۔ ایک مضبوط کڑیوں کا جال تھا جو اس کے اطراف بچھایا جا رہا تھا۔

رنجنا چُپ چاپ گھُٹی گھُٹی سہمی سہمی سی ضرور رہتی مگر تنہائی میں اکثر دیر تک سوچا کرتی "ستیش ایسی عجیب و غریب حرکات کیوں کرتا ہے؟" سوچ سوچ کر اُس کا سر منوں بھاری ہو جاتا مگر نتیجہ پھر بھی صفر ہی نکلتا۔ آخر ہار کر بیچاری یہ سوچ کر چُپ ہو جاتی کہ "اگر اب ستیش نے مجھے تنگ کیا تو میں ضرور ڈیڈی سے کہدونگی"۔

اُس کا ترو تازہ، چاق و چوبند چہرہ جانے کس آگ میں بھسم ہو گیا تھا۔ اُسکے لاابالیانہ قہقہے جانے کونسے اژدہا کی زد میں آگئے۔ اس کی ہنسی کے پھوارے جانے کیوں سُوکھ کر آہوں میں تبدیل ہو گئے۔ کچھ تو تھا جو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ مگر جو کچھ تھا سب اُس کے اندر تھا۔ زبان پر کوئی گلہ کوئی شکایت نہ تھی، البتہ چہرے پہ رنج و ملال ضرور تھا۔ اتنا کہ شاید غم کا پہاڑ ٹوٹنے پہ بھی نہ ہو۔ جب کبھی ستیش اُس سے پیار کرنا چاہتا یا یونہی اُس کے پاس آبیٹھتا تو اُس کی باتوں سے ایک چیز صاف طور پر عیاں ہوتی اور وہ تھی ستیش سے کھردری نفرت۔

ایسی کڑوی نفرت کے باوجود وہ ستیش کو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی۔ رنجنا کی معصومیت سر تا پا سحر تھی۔ یہ معصومیت ستیش پر جانے کیوں بھوت کی طرح سوار تھی۔ جب یہ بھوت زور پکڑتا تو ستیش اُس کے دونو بازو اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا اور پھر جانے کیوں رنجنا کی شریانوں میں، گوشت کے ایک

ایک ٹکڑے سے نفرت پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگتی۔ اُسکی گردن پہ ایک تل بھی تھا جو نہایت ہی بھلا معلوم دیتا تھا۔ اس کی اس سے زیادہ موزون جگہ شائد اور کوئی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ خُوب پھبتا تھا ستیش کئی بار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ "یہ تل خوبصورت ہے یا گوری گوری نمکین سی ملائم گردن؟ تل نہ ہوتا تو شائد یہ گردن اتنی خوبصورت، اتنی پیاری نہ ہوتی اور اگر گردن نہ ہوتی تو تل۔۔۔ "میں بھی کیسا واہیات آدمی ہُوں"۔ وہ اپنے شانوں کو زور سے جھٹکتا اور اپنا خیال کسی دوسری طرف مبذول کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔

ستیش سب کچھ سوچتے اور سمجھتے ہُوئے بھی جانے کیوں اُسے چھیڑے بغیر نہ رہتا۔ رنجنا بھی شبانہ روز مُصمّم ارادہ کرتی کہ اب کے ضرور ڈیڈی سے کہے گی۔ مگر وہ کبھی بھی نہ کہہ سکی۔ اِس چھیڑ چھاڑ کے دوران میں اگر کبھی رنجنا کی ممی آ جاتی تو وہ ستیش کو گھُور کر کہتی۔

"جوان لڑکیوں کو یوں نہیں چھیڑا کرتے"۔

"کیوں جی؟" ستیش رنجنا کے شانے پر چُٹکی بھرتے ہُوئے کہتا۔

"بے شرم! چُغد کہیں کا! کہا جو ایسا نہیں کیا کرتے"۔ رنجنا کی ممی طمانچہ دکھاتے ہُوئے کہتی ستیش اس کے کان امیٹھتا اور پھر اس کی چوٹیاں دونوں ہاتھوں سے کھینچنے لگتا۔ رنجنا کی ممی طمانچہ اُٹھائے اُس کی طرف آتی اور وہ بچھڑے کی طرح کُودتا دُور بھاگ جاتا۔ رنجنا کی ایک اور بڑی بہن بھی تھی مگر وہ اُسے بہت کم چھیڑا کرتا۔

اگر کبھی چھڑتا بھی تو یوں محسوس کرتا جیسے کسی نے زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا ہے۔ اگر اس کے بدن پر ستیش کا ہاتھ پڑ جاتا تو اسے یوں لگتا جیسے برف کے ڈھیلے ہاتھ میں آگئے ہیں اور سرد چیزوں سے ستیش کو حد سے زیادہ نفرت تھی۔

ایک دوپہر رنجنا اپنے کمرے میں نیم دراز تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یونہی بیٹھے بیٹھے نیند آگئی ہے۔ انگیا سے کسی ہوئی چھاتیوں کا زیر و بم پر کیف تلاطم پیدا کر رہا تھا اُس کا ایک ہاتھ گلے کے اندر سے ہوتا ہوا چھاتیوں پر جا پڑا تھا اور اس دباؤ سے قمیص کے سب بٹن کھل گئے تھے۔ گردن کے نیچے اونچی گھاٹیوں کے درمیان کی گہرائی نمکین سی خوبصورتی نے اور سینے کی جنبش نے ستیش کی آنکھوں میں نشہ سا پیدا کر دیا۔ یہ سب کچھ ستیش نے اپنے کمرے سے دیکھا جو اس کے کمرے سے ملحق تھا۔ دل کو موہ لینے والی خوبصورتی نے اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا کر دی۔ وہ کھڑکی سے اس کے کمرے میں کود گیا اور دونوں ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال کر اُس کو زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیئے۔ پھر اُن کو اتنا چوسا کہ اُن کی سُرخی نیلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ رنجنا گھبرا کر اُٹھی اور بھاری بھاری پلکوں سے اُس نے نہائیت ہی غضبناک نگاہوں سے ستیش کی طرف دیکھا۔ مگر منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

"مجھے تم سے بے حد محبت ہے رنجنا! میں تمہیں حد سے زیادہ چاہتا ہوں۔ ستیش نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ غصّے سے بھری ہوئی۔ جب ستیش چلا گیا تو خوب دل کھول کر روئی۔ مگر رونا بھی کوئی کسی دُکھ کا مداوا ہے۔ "دیوانہ" "واہیات" وہ بڑبڑائی

واپس آکر جانے کیوں ستیش کا ضمیر اُسے ملامت کرتا رہا۔ مجوب اور پشیمان دیر تک سوچتا رہا کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُس کا جی چاہا کہ واپس جاکر اُس سے معافی مانگ لے مگر وہ سوچتا ہی رہا اور ایسا نہ کر سکا اور وہ یوں دل کو تسلّی دینے لگا۔

"رنجنا! کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ میں کیوں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم بالکل تو شی ہو اور شاید تم نہیں جانتیں کہ توشی سے مجھے کتنی محبت ہے۔ یہ وہی توشی ہے جسے میں دیوی کی طرح پُوجا کرتا تھا اور جسے مجھ سے بے پناہ محبت تھی اور جسے تقسیم ہند نے اُفق کے اُس پار پہنچا دیا تھا۔ رات کی تنہائیوں میں اُس کی رسیلی باتیں میں اب بھی سُنا کرتا ہوں اور تم کیا جانو میری محبت میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے۔ رنجنا! تم جانے مجھے کیا سمجھتی ہو۔ تم عقیل ہو۔ تمہیں یہ سب کچھ خود سوچنا چاہیئے۔ دنیا میں ایک ہی محبت نہیں۔ محبت کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ ماں کی محبت، باپ کی محبت، بہن کی محبت، بھائی کی محبت۔ تمہاری اور میری محبت ایک بہن اور بھائی کی محبت ہے۔ اگرچہ یہ بات میں تم سے کبھی نہیں کہہ سکا مگر تمہیں خود ہی سب کچھ سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ آخر تم بھی ایک پڑھی لکھی جوان لڑکی ہو۔ رنجنا! "محبت" ماچس کی ڈبیا ہے جس کی ہر سلائی روشنی میں لپٹی ہوئی ہے"۔ اور پھر وہ دیر تک سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات کے متعلق سوچتا رہا۔

اُس دن رنجنا بے حد اُداس رہی۔ ایسی اُداسی ایسی بجھی بجھی، کجلائی ہوئی چنگاری کی

طرح وہ کبھی بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ اُس دن رنجنا نے ستیش کے متعلق بڑے بیہودہ بڑے بھدّے انداز سے سوچا۔ "یہ دیسی اور ولائتی تہذیب کا ڈھانچا بہن اور عام لڑکی میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھتا بے شرم۔ کمینہ، رذیل، کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ پلید زنجیر مجھے بُری طرح جکڑ رہی ہے۔ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ میری ممی، میرا ڈیڈی۔ میرا دیسی دادا، میری ولائتی دادی، یہ سب میرے لئے زنجیریں ہیں۔ زنجیریں جیسے کڑوی کسیلی بنولیاں۔ یہ سنگلاخی زنجیریں توڑے بغیر میں دم نہ لُونگی"۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور تپنے لگا۔

اُس شام وہ کھانے پر نہ آئی اور صبح ناشتے پر بھی غیر حاضر تھی۔ تلاش ہُوئی تو معاملہ ندارد تھا۔ سب گھبرائے گھبرائے پھرنے لگے۔ مگر ستیش رنجنا کی سی مستقل اور پُر وقار خاموشی لئے بیٹھا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے بہت کچھ سوچ رہا تھا شاید یہ کہ "وہی ہُوا جس کا مجھے ڈر تھا رنجنا تم نے مجھے ہمیشہ غلط سمجھا۔ کاش تم میری مجبوری جان گئی ہوتی۔ میں ہمیشہ انتہائی کوشش کرتا رہا کہ تم سے بات تک نہ کروں مگر۔ مگر.......... رنجنا تم نے مجھے بھائی ہوتے ہُوئے بھی بھائی نہ سمجھا"! اور اس کے دماغ کے کسی کونے سے بار بار یہ سوال اُٹھنے لگا۔

"کیا اس سارے کھیل کا میں ذمہ دار نہیں؟"

رنجنا کی ممی سر پیٹتی ہُوئی رائے بہادر کے پاس گئی اور لڑکی کے بھاگنے کی ساری کیفیت کہہ سُنائی۔ پھر غصّے میں آگئی۔ "میں نہ کہا کرتی تھی تینوں کی شادی کر دو تینوں جوان ہیں مگر آپ کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بَیر ہے۔ جو میں کہہ دُوں نہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کہتے تھے نا خود پسند کرلیں گے سیانے ہیں۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے آخر آزادی کا۔ اور

لوگ بھی آزادی دیتے ہیں مگر آپ کی طرح نہیں۔ راجندر کی بھی تو جوان لڑکی ہے۔ سنیما بھی دیکھتی ہے، گدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔ خود منسٹر ہیں۔ لڑکی بی۔ اے میں پڑھتی ہے۔ وہ کیوں نہیں بھاگ گئی؟ کوئی طریقہ سلیقہ بھی ہونا چاہیئے۔"

رائے صاحب چُپ رہے۔ اُنہوں نے صاف طور پر تو اپنی اولاد سے کبھی نہ کہا تھا کہ لو میرج کر لو۔ ہاں اشاروں کنایوں میں یہ ضرور ظاہر کرتے تھے کہ لو میرج کرنا میرے نزدیک معیوب نہیں۔ رہا سوال اولاد کی نگرانی کا وہ انہوں نے کبھی کی ہی نہ تھی۔ اُن کو زندگی میں دو ہی چیزیں عزیز تھیں۔ کار اور شراب۔ انہی میں وہ مدہوش رہتے۔ کار اس لیئے تھی کہ اُس پر ہر روز ایک نیا شکار لاد کر دریا کنارے یا کسی سیرگاہ میں لیجایا جاتا اور پھر شراب کا دَور چلتا۔

پہلے وہ اپنی بیوی کی بالکل نہ سُنا کرتے تھے۔ اُلٹا اس پر تنقید کیا کرتے۔ مگر اب وہ اِن معاملات میں بالکل خاموش رہتے بستیش سے بھی زیادہ سنجیدہ۔ کوئی بات پُوچھنے پر اُن کے منہ سے ایک "ہُوں" تک نہ نکلتی۔ "نیا شکار" اور "سیرگاہ" سب کچھ بھول گیا۔ ہاں روزمرّہ کے کاموں میں صرف ایک بات کا اضافہ ہُوا کہ اُس دِن سے انہوں نے شراب خوب پینا شروع کر دی۔ +

(ریڈیائی ڈرامہ)

آندھی اور بگولے

افراد

آفتاب	شاہین کا خاوند جمیلہ کا دوست
جمیلہ	زمرد کی بیوی آفتاب کو چاہنے والی
زمرد	ایک امیر انسان مگر ناکام خاوند
شاہین	آفتاب کی صابر اور عقیل بیوی

آندھی اور بگولے

(خوشی کے ساز بجتے ہیں۔ کچھ دیر بعد سازوں کی
آواز فیڈ آؤٹ کر دی جاتی ہے اور ذیل کا مکالمہ سپر امپوز
کیا جاتا ہے)

جمیلہ۔ آفتاب ڈارلنگ کسی کو یقین تھا، یہ بھی ماننے میں آتا تھا کہ میرا گھر بھی سورگ بن سکتا ہے؟ زمانہ تو میری زندگی پر کاجل کا لیپ کئے چلا آ رہا تھا۔

جمیلہ۔ اب تک میں پھسلن پر چل رہی تھی اور ہر چوتھے قدم پر سنگلاخ چٹانوں سے سر پھوڑنا پڑتا تھا —— پھسلن اور چٹانیں —— مگر اب......

آفتاب۔ مگر اب؟ .... کیا؟

جمیلہ۔ مگر اب ....

آفتاب۔ مگر اب تم نے فلک کا دامن کھینچ کر اُن کے جلتے پھرتے مردوں کا منہ ڈھانپ دیا ہے۔

جمیلہ۔ (متانت سے) ہاں۔

آفتاب۔ اور تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ یہ وہ مردے ہیں جو محبت کے معاملہ میں رخنہ اندازی کرنے کے لئے قبر سے بھی بھاگ آتے ہیں۔ تمہیں یہ تو معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی کو کامیاب ہوتے دیکھ کر حسد کے مارے ان کی روحیں تڑپ اُٹھتی ہیں۔ جل جاتی ہیں اور یہ .... اور یہ .... مجھ سے ان کے متعلق زیادہ نہ کہلواؤ۔ ڈارلنگ ورنہ میں پاگل ہو جاؤنگا۔

جمیلہ۔ آپ سُنیں تو۔

آفتاب۔ جمیلہ تم خود جمیل ہو اس لئے ہر بات کے جمیل پہلو کے متعلق سوچتی ہو مگر ایک دوسرا پہلو بھی ہوتا ہے جس کے متعلق شائد تم نے کبھی نہیں سوچا اور جس کے متعلق جب بھی میں نے سوچا خوف کے مارے میری روح تک سمٹ گئی۔

جمیلہ۔ آفتاب جی آپ آفتاب ہیں ہر شے پر روشنی ڈالنا اور اپنی حرارت سے اُن کو جنبش، ایک تڑپ جس میں زندگیوں کی کامیابی کے راز مضمر ہوتے ہیں دینا آفتاب ہی کے حصے میں آتا ہے۔

آفتاب۔ میرے ساتھ فقرے بازی نہ کرو۔ تمہاری آنکھیں، تمہارے لب غمازی کر رہے ہیں کہ .... یہ تم نے مجھے گھورنا کیوں شروع کر دیا؟

جمیلہ۔ ہا۔ کوئی خاص بات نہیں۔

مگر تمہاری شاطرانہ مسکراہٹ میں ایک تلخ سی عیاری چھپی ہوئی ہے جیسے تم ....

جمیلہ۔ میرے لیے ایٹم بم تیار کر رہی ہو؟

آفتاب۔ ہاں شاید اس سے بھی کوئی زبردست طاقت۔

جمیلہ۔ ایسی کئی طاقتیں مل کر بھی آفتاب کا مقابلہ نہ کرسکیں گی۔ ڈارلنگ کیونکہ..........

آفتاب۔ پھر شاعری ہونے لگی ——— جمیلہ ——— جب میں تمہاری باتیں سنتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کنوارے لوٹے میں کوئی تانبے کے رنگ ایسی نئی نویلی املی بھگو کر پینا شروع کردی ہو ——— جمیلہ..........

جمیلہ۔ چھوڑیئے بھی اس قصّہ کو ——— آؤ گائیں۔

آفتاب۔ کیوں؟ شرما کیوں گئیں؟ ——— آج ضرورت سے زیادہ خوش نظر آرہی ہو کوئی خاص بات ہے؟

جمیلہ۔ ہے تو۔ بتاؤنگی مگر آئیے پہلے گائیں۔ میرے ساتھ گاسکیں گے آپ؟

آفتاب۔ کیوں نہیں۔ یہ کونسا مشکل کام ہے۔ جہاں کوئی بہت مشکل تان آجائیگی رو دونگا۔

جمیلہ۔ آپ کا مطلب ہے گانے کا ستیاناس کر دیا جائے۔ نا بابا نا۔ میں اکیلی ہی گالیتی ہوں۔ آپ اطمینان سے سنتے جایئے اور بس۔

آفتاب۔ بہت اچھا حضور۔ سر تسلیم خم ہے میرا مطلب تھا خم ہے جو مزاج.......

جمیلہ ۔ زیادہ باتیں نہ بنایئے ۔ سُنئے ایک شرط ہے ۔

آفتاب ۔ بھئی شرط تو پوری ہو سکتی ہے مگر جیسا کہ تمہاری عادت ہے شرطے پیش کرنے کی		اگر شرطا ہُوا تو ؟

جمیلہ ۔ (کِھی کِھی کِھی) فکر نہ کیجئے شرط ہی ہے ۔

آفتاب ۔ پھر ارشاد فرمایئے ۔

جمیلہ ۔ آپ کو بھی کچھ نہ کچھ سُنانا ہو گا ۔

آفتاب ۔ چاہے مغلظات ہی سناؤں یا یونہی واہی تباہی بکنے لگوں مگر سناؤں ضرور کچھ ۔

جمیلہ ۔ (کِھی کِھی کِھی) ہاں یونہی سہی ۔ اگر آپ ایسے حربوں ہی پہ اُتر آئے ہیں ۔ تو ۔

آفتاب ۔ اچھا چلئے ۔ کوشش کرونگا ۔

جمیلہ ۔ (کِھی کِھی کِھی)

(ساز بجنے لگتے ہیں جس کی "سُریں" تانیں ہیں جمیلہ گاتی ہے)

رات سکھی اِک سپنا دیکھا بڑا سہانا سپنا
جیسے پلنگ پہ سوئی ہُوں ، تان چندریا دھانی
مَیں سوئی ہوئی جاگ رہی ہے ، میری مست جوانی
چِرچِر کرتا دوار کُھلا اور میں گھبرا کر جاگی
کسی تنی موری انگ تنگ چولی جھلمل کرنے لاگی

اتنے میں کوئی سہمے سہمے آنگنوا میں آیا
گھبرایا گھبرایا

آفتاب۔ (گاتا ہے)

ڈرتے ڈرتے اس نے اِک مرمریں جسم اُٹھایا
رخساروں کی حدت سے اس کا ہونٹ کپکپایا
دو دُھائے پانچ اور ایک ڈھایا ۔۔۔ ڈھایا

(ساز بند ہو جاتے ہیں)

جمیلہ۔ (برافروختہ لہجے میں) یہ کیا؟ آپ میرا گیت نہیں سنیں گے؟

آفتاب۔ واہ سنیں گے کیوں نہیں تم تو یونہی آنکھیں دکھا رہی ہو۔

جمیلہ۔ اور یہ جو بیچ میں ٹانگ اڑا دی گئی ۔۔۔۔۔۔ کوئی ایسے بھی گیت سنتا ہے؟

آفتاب۔ ہاں۔

جمیلہ۔ کون؟

آفتاب۔ میں۔

جمیلہ۔ (کھی کھی کھی کھی) آپ کو تو بس ہر وقت شرارتیں ہی سوجھتی ہیں۔

آفتاب جی۔

جمیلہ۔ آپ میری طرف یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟

آفتاب۔ جمیلہ اس گورے چٹے رنگ پہ یہ نیلی رگیں ایسے لگتی ہیں جیسے ....

جمیلہ۔ اب آپ نے شاعری شروع کر دی۔

آفتاب۔ اچھا جمیلہ یہ بتاؤ ——— نہیں پہلے وعدہ کرو کہ سچ سچ بتاؤ گی۔

جمیلہ۔ وعدہ کرتی ہوں۔

آفتاب۔ قسم نہیں کھاؤ گی۔ اس طرح تو تم مکر بھی سکتی ہو۔

جمیلہ۔ ڈارلنگ اس وقت بھوک نہیں۔

آفتاب۔ ہا ہا ——— ہا۔ اچھا نہ کھاؤ بھئی۔ کیا بھولپن سے کہا ہے تم نے ——— جمیلہ ——— تمہاری چندھیا دینے والی خوبصورتی نے مجھے تو تم سے محبت کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر تم نے مجھ میں کیا دیکھا تھا؟

جمیلہ۔ آفتاب۔

آفتاب۔ ابھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ سچ سچ بتاؤ گی۔

جمیلہ۔ تو کیا میں نے جھوٹ بولا ہے؟

آفتاب۔ محترمہ کس بھولپن سے پوچھتی ہیں "کیا میں نے جھوٹ بولا ہے"؟ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ایک بار پھر کہیئے تو بھلا؟

جمیلہ۔ (ہنستی ہے)

آفتاب۔ بھئی بتاؤ بھی، دیکھو پھر میں ......

جمیلہ۔ اچھا پہلے گیت مکمل کرلوں میرا مطلب ہے پورا گیت سنالوں پھر بتاؤنگی

(ساز چھڑتے ہیں جمیلہ گاتی ہے)

ٹھہرا اِت اُت دیکھا اُس نے، دیکھ مجھے مُسکایا
دبے دبے ہولے ہولے، میرے پلنگ تک آیا
جان بوجھ کر بنی رہی میں آنکھ موندھ کر سوئی
جی میں سوچ رہی تھی دیکھوں کیا کرتا ہے کوئی
پیار سے اُس نے میرے مُکھ سے جب چُنری سرکائی
روم روم میں، انگ انگ میں، بجلی سی لہرائی
لی میں نے انگڑائی

آفتاب۔ (گاتا ہے) ہندو مسلم سکھ عیسائی سب ہیں آپس میں بھائی بھائی۔

(ساز مدھم ہو جاتے ہیں)

جمیلہ۔ پھر وہی بات۔

آفتاب۔ کونسی؟ ——— اوہو اتنا غصہ۔ تم تو یونہی ناراض ہوتی ہو۔ میں نے تو ——— خیر سناؤ۔

(ساز پہلی جگہ پر آجاتے ہیں)

جمیلہ ۔ (گاتی ہے)　　کیسے رات گزاری ہم نے ہوش نہیں تھا اپنا
رات سکھی اِک سپنا دیکھا بڑا سہانا سپنا

آفتاب ۔ (گاتا ہے اور ساتھ ساتھ بھونڈے انداز سے ناچتا ہے)
رات سکھی ہم نے سیکھا اِک نئی مالا جپنا
جپنا جپنا جپنا جپنا سکھی اِک نئی مالا جپنا

جمیلہ ۔ واہ واہ وا (مصنوعی ٹھنڈی آہ بھرتی ہے) کسی نے بالکل سچ کہا ہے۔
بھینس کے آگے مرلی بجانا فضول ہے۔"

آفتاب ۔ تو گویا ہم بھینس ہوئے ۔ ہوُں ۔

جمیلہ ۔ (منہ چڑاتی ہے) تو ہم بھینس ہوئے ۔

آفتاب ۔ (اُسے اور چڑاتا ہے) بھینس تو تم خود ہو ۔ وہ اِس طرح کہ
پہلی بات تو یہ ہے ۔ کہ بھینس مؤنث ہوتی ہے اور تم بھی مؤنث ہو دوسری یہ کہ تم عقل کے لحاظ سے بھینس ہو ۔ تیسری یہ کہ تم بھینس کی طرح موٹی ہو ، چوتھی یہ کہ تم بھینس کی طرح پلپلی ہو ۔ ہاں ایک بات تم میں ہے کہ بھینس کا رنگ کالا ہوتا ہے اور تم ذرا گوری ہو ۔ خیر بھورے رنگ کی بھی بھینس ہوتی ہے اگر تمہیں اُس سے بھی مشابہت پسند نہیں تو بھئی ہم تمہیں ولائیتی بھینس کہہ لیں گے آخر مجبوراً ....

جمیلہ ۔ (پھر منہ چڑاتی ہے) تو ہم تمہیں ولائیتی بھینسا کہہ لیں گے ....

آفتاب۔ ارے آنسو؟ یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیسے؟ تم تو آج بہت خوش تھیں (زیرِ لب) بھئی ہیں بڑے پیارے، چمکیلے سفید براق جیسے شبنم کے قطرے۔ جیسے ننھے ننھے سفید موتی۔

جمیلہ۔ (منہ چڑاتی ہے) تم تو آج بہت خوش تھیں (غصّہ سے) جب ایسے بھینسوں سے پالا پڑے تو کوئی خاک خوش رہ سکتا ہے۔

آفتاب۔ اچھا جی اب رونا دھونا چھوڑو نہ تم بھینس نہ ہم بھینسے۔ کیوں تو ٹھیک ہے نا؟

(اس کی ران پر چٹکی بھرتا ہے دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں)

جمیلہ۔ اِدھر اُدھر کی ہانک کر وقت نہ ضائع کیجئے۔ میری بات بھی سُنیں گے یا نہیں؟

آفتاب۔ بکواس فرمائیے۔ معاف کیجئے میں کہنا چاہتا تھا ارشاد فرمائیے بھئی آنکھیں کیوں دکھا رہی ہو۔ سنونگا نہیں۔ اوہو۔ دراصل جب تم اس طرح آنکھیں دکھاتی ہو تو میں بہک جاتا ہوں۔ اب آنکھیں پرے بھی کرو۔ بھئی سنونگا سنونگا سُنونگا کیوں نہیں بھلا تمہاری بات نہ سنوں گا تو اور کس کی سنوں گا۔ ولائیتی بھینس کی؟

جمیلہ۔ پھر بُرا نے چالے ــــــ دیکھو ڈارلنگ ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔

آفتاب۔ نصیحت بی بی اب کہو گی بھی یا ....

جمیلہ۔ کہونگی مگر پہلے مٹھائی کھلایئے۔

آفتاب۔ ایسا ہی معاملہ ہے؟

جمیلہ۔ جی ہاں۔

آفتاب۔ دیکھو بھئی اگر مٹھائی کھلانے والی بات ہوگی تو ضرور کھلاؤنگا۔

جمیلہ۔ دیکھیئے ہماری شادی نہیں ہو سکتی نا؟ مگر ہو سکتی ہے۔

آفتاب۔ پہیلیاں نہ بجھاؤ صاف صاف بتاؤ۔

جمیلہ۔ جناب یہ پہیلیاں نہیں ہیں، میں اس کا مکمل حل بھی بتاؤنگی۔ اگر آپ عمل کرینگے تو پھل پالیں گے نہیں تو بنیولیاں تو ہیں ہی۔

آفتاب۔ اب بتاؤ گی بھی یا نہیں کہ اینٹھوں ناک تمہاری، پھر پاؤ پاؤ بھر کے آنسو گرانے لگو گی۔

جمیلہ۔ جیسے میں کہونگی کرلیں گے نا آپ؟

آفتاب۔ سُننے کے بعد فیصلہ کر سکوں گا۔

جمیلہ۔ میں نے سوچا ہے آپ شاہین سے شادی کریں۔

آفتاب۔ (حیران ہو کر) شاہین کون؟ تمہاری چھوٹی بہن؟

جمیلہ۔ ہاں (ہنستی ہے) کیسی رہی (ہنستی ہے) اس طرح ہمیں کافی وقت مل سکیگا اور پھر آزادی کی آزادی۔ کتنی اچھی اور کام کی بات سوچی ہے میں نے (ہنستی ہے) آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت۔ آپ چُپ کیوں ہو گئے؟ آپ

میری عقل پر دنگ رہ گئے ہیں اسی لئے تو دو لفظ داد کے بھی ادا نہیں کر سکے ۔ اب بتائیے عورت عقل کی بھینس ہوتی ہے ؟ (ہنستی ہے) آپ نے ساری زندگی میں ایک بھی ایسی اچھی بات نہ سوچی ہوگی ۔ کیوں ؟ (ہنستی ہے)

(ہنسی تیز ہو جاتی ہے موسیقی کا طربیہ ریکارڈ بجتا ہے جس میں ہنسنے کی آواز دب جاتی ہے ۔ ریکارڈ کے ختم ہوتے ہی ذیل کا مکالمہ امپوز کیا جاتا ہے)

زمرد ۔ جمیلہ تم خوف سے مفلوج نظر آ رہی ہو ——— جمیلہ تم اپنی آرزوں کو مقدم ضرور سمجھو مگر میرے دل میں جو کسی آگ کی سوزش، کسی شعلے کی جلن ہے ..

جمیلہ ۔ آپ یونہی بدگمان ہو رہے ہیں میرے سرتاج ۔

زمرد ۔ یہ کہتے وقت تمہاری آواز حلق میں کیوں اٹک گئی ؟ تم سہمی سہمی کیوں ہو ؟ یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیسی اڑنے لگیں ؟ تم بد حواس سی کیوں ہو رہی ہو ؟ ——— جمیلہ نامرادی میرے کانوں میں سائیں سائیں کر رہی ہے ۔ میں بھک منگوں کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوں کہ ....

جمیلہ ۔ وہم کا کوئی علاج نہیں ۔

زمرد ۔ تمہاری حزیں مسکراہٹ کے پیچھے ضرور کوئی بہت بڑا طوفان چھپا ہے ۔ تم نہ بتاؤ مگر یہ مسکراہٹ جس میں ہزار ہا حسرتیں منجمد ہیں ——— تمہاری آواز ڈوبی ہوئی کیوں ہے ؟ اس میں پہلی سی تڑپ کیوں نہیں رہی ؟ ———

جمیلہ مایوسی کی اس عمیق کھائی سے تم نے مجھے کبھی بچانے کی کوشش نہیں کی ـــــ
ـــــ کاش میری زندگی میں بھی کوئی فرخندہ ساعت آتی

شادی میں میں نے اس فرخندہ ساعت کے لئے کھڑکھڑاتے ہوئے سرخ نیلے سبز نوٹ تاش کے پتوں کی طرح ضایع کئے مگر...... کاش...... کاش.........

جمیلہ۔ کسی کو یوں بھی حقارت کے پاؤں سے نہ ٹھکرانا چاہیئے۔ آپ نے یونہی ایک خیال کو اپنے دل کے سنگھاسن پہ بٹھا لیا ہے۔ ـــــ ویسے اگر آپ کا یہی خیال تھا تو آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ان رنگ برنگ نوٹوں کی کھڑکھڑاہٹ کسی کی دردبھری چیخوں کو نہیں دبا سکتی۔ یہ میں نے عام بات کی ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

زمرد۔ جمیلہ میں تمہیں حقارت کے پاؤں سے ٹھکرا رہا ہوں؟ بقول تمہارے میں نے تمہیں اُس دولت اور شہرت کے عوض خریدا جو میری وجہ سے تمہارے باپ کو ملی مگر جمیلہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تمہاری محبت کبھی خریدنے کی جرأت نہیں کی اور نہ اس واہیات کھڑکھڑاہٹ سے کسی کی نزع کی چیخوں کو دبانے کی کوشش کی ـــــ (انہائیت ہی حسرت سے) جمیلہ ایک بات بتاؤ۔ کیا میں تمہارے نزدیک انسان نہیں ہوں؟

جمیلہ۔ مجھے شرمندہ نہ کیجئے میرے سرتاج۔ غصہ میں ایک بات منہ سے نکل گئی تھی اب آپ عورتوں کی طرح روز اُسے لے بیٹھتے ہیں۔

زمرد۔ یقین جانو جمیلہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اس لئے کہ تم میں تمام کائنات کا رس موجود ہے۔ آخر تم میری ساری محبت کے عوض ایک نظر التفات تک بھی کیوں عنائیت نہیں کر سکتیں؟ ایسی جس میں کوئی عیاری نہ ہو۔ جمیلہ کیا میں شریف انسان نہیں؟ میری عزت ہے، شہرت ہے، دولت ہے۔ مجھ میں ایک بھی عیب نہیں، سگریٹ تک سے گریز کرتا ہوں۔ تم بتاتی کیوں نہیں کہ میں کیوں تمہاری محبت کے قابل نہیں۔ بتا دو آخر اس میں قباحت ہی کیا ہے۔

جمیلہ۔ آپ .... آپ ....

زمرد۔ تمہارے چہرے پہ میں سوچ کو بالکل برہنہ دیکھ رہا ہوں ——— یہ ٹھیک ہے ——— کچھ نہیں ——— میں دھتورے کا پھول ہوں۔ جہاں گلاب کے پھول ہوں وہاں دھتورے کے پھول کی محبت کب غالب آسکتی ہے ——— تم ٹھیک راہ پہ جا رہی ہو جمیلہ۔ (ہنستا ہے۔ ہنسی جس میں دکھوں کے ہجوم ہیں) میں ہی تجھے بھٹکا رہا تھا (ہنستا ہے) میں ہی بیوقوف ہوں (ہنستا ہے) گدھا۔ (دیوانہ وار ہنستا ہے)۔

(غم افزا موسیقی کا ٹکڑا جس میں ہنسی کی آواز تحلیل ہو جاتی ہے اور ذیل کا مکالمہ سپر امپوز کیا جاتا ہے)

آفتاب۔ شاہین۔

شاہین۔ جی۔

آفتاب ۔ تم ایسی حسین ہو جیسے لچکیلے خیال یا جیسے مرمریں خواب ۔ تمہیں دیکھ کر پیاسی خواہشیں تڑپ اُٹھتی ہیں ـــــــــ شاہین آج سینما چلیں گے ۔

شاہین ۔ (افسردگی آمیز متانت سے) باجی بھی چلے گی نا ؟

آفتاب ۔ یہ تم ہر بات میں اپنی باجی کو کیوں گھسیٹ لاتی ہو ؟

شاہین ۔ (روحانی تکلیف محسوس کرتے ہوئے) آپ ہی نے تو کہا تھا ...... نہیں ... کچھ نہیں ۔

آفتاب ۔ شاہین ! تم نے مجھے ذلت کی دلدل سے بچا لیا ـــــــــ شاہین مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم خوبصورتی کا سرچشمہ ہو اور ـــــــــ اور ـــــــــ

شاہین ۔ (ہنستی ہے) آپ کو بنانا خوب آتا ہے ۔

آفتاب ۔ یہ علیل ہنسی مجھے پسند نہیں ۔ شاہین صحت مند قہقہے لگایا کرو مجھے معلوم ہے میرا دیا ہوا صدمہ تم اُوک سے پیتی رہی ہو مگر اب بھول جاؤ ۔ پُرانی کدورتیں دل سے نکال دو ـــــــــ شاہین گناہ معاف بھی کیا جا سکتا ہے میں اس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوں ۔

شاہین ۔ آپ مجھے اتنا شرمندہ کیوں کر رہے ہیں ۔ میں زمین میں گڑی جا رہی ہوں ۔ آپ نے کونسا گناہ کیا ہے ؟ آپ بھلا گناہ کیوں کرنے لگے ۔

آفتاب ۔ شاہین تمہاری پرواز نے مجھ ایسوں میں بھی بلندیوں میں اُڑنے کی خواہش پیدا کر دی ہے ۔ اللہ کسی کو بیوی دے تو ایسی دے ۔

شاہین ۔ آپ نے پستیوں کی طرف قدم ہی کب اُٹھایا تھا ۔

آفتاب ۔ شاہین ۔

شاہین ۔ جی ۔

آفتاب ۔ ایک بات پوچھوں ؟

شاہین ۔ جی ۔

آفتاب ۔ تم نے کسی سے کہا تھا کہ بچے کی وجہ سے میں تمہیں بھی بلا لیتا ہوں ۔

شاہین ۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) میری زبان میں کیڑے پڑیں اگر میں نے کسی سے کبھی بھی کچھ کہا ہو ۔

آفتاب ۔ مجھے یقین ہے تم نے کبھی کچھ نہیں کہا ہوگا ۔ اپنے متعلق ایسے ننگے لفظ نہ بولا کرو میری جان ۔

شاہین ۔ (خوش ہو کر) سینما کا وقت ہو رہا ہے، بھول گئے آپ ؟

آفتاب ۔ نہیں تو ۔

شاہین ۔ باجی بھی چلے گی نا ؟

آفتاب ۔ پھر وہی بات ۔ شاہین میں تجھے یقین دلاتا ہوں ۔ پلید ہوس کی برفانی سلیں معدوم ہو چکی ہیں ۔ اب اسے تمہارے سوا کسی حسن کی گرمی نہیں پگھلا سکتی میں نہیں جانتا تھا یہ مرمریں خواب اصل میں کڑوی حقیقتیں ہوتی ہیں ۔

شاہین ۔ اگر میں غلط نہیں سمجھی تو یہ آپ کی باتیں آج دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں ۔ میرے مالک آپ نے یہ بڑا اچھا کیا ۔ موتی کی آب ہی آبرو ہوتی ہے ۔ اس کے بغیر موتی پانی کا ناچیز قطرہ ہے ۔

آفتاب ۔ میں بڑا خوش قسمت انسان ہوں کہ تمہارے حریم دل میں کسی ناسدا آرزو کا

سایہ بھی نہیں پڑا۔ اب غم آنسوؤں کی صُورت بہانا چھوڑ دو جانِ من۔

شاہین۔ (ہنستی ہے) آپ اچانک ایسے کیوں ہو گئے؟

آفتاب۔ کیوں ہو گیا کا جواب تو میرے پاس ہے نہیں البتہ اچانک نہیں ہوا یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔

شاہین۔ مگر........

آفتاب۔ بس کرو۔ مجھے سرد محبت پسند نہیں۔

شاہین۔ پہلے بھی سرد ہی ہو گی یا اب ہو گئی؟

آفتاب۔ شاہین جو عورت اپنے خاوند کے ساتھ دغا کر سکتی ہے۔ اپنی سگی بہن کو اپنی خواہشوں پر قُربان کر سکتی ہے —— کیا ایسی عورت عورت کہلانے کی مستحق ہے؟ کیا ایسی عورت محبت کر سکتی ہے؟ —— شاہین نفرت جب پگھلتی ہے تو محبت بن جاتی ہے اور محبت جب جم جائے تو نفرت ہو جاتی ہے

شاہین۔ میرے آقا۔

آفتاب۔ میں خوش ہوں کہ تمہاری آنکھوں میں مسرّتیں ناچ رہی ہیں۔

شاہین۔ میرے مالک۔

(خوشی کے ساز بجتے ہیں۔ سازوں کی آواز آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ کر دی جاتی ہے)

مداوا

پیار کی ڈوری!
ٹوٹ گئی۔

میں نے دیکھا ڈوری کے سرے پر کوئی ایسا نشان نہ تھا جہاں پہلے کبھی محبت اور نفرت کا اتصال رہا ہو۔ میل رہا ہو۔

بکھری ہوئی ڈوری جو میں نے تمہاری طرف پھینکی"۔ محبت کی دھکتی ہوئی زرپاشیاں کرتا ہوا تار تھا اور وہ روڑا جو اس کے ساتھ بندھا ہوا تھا میرے دل سے کہیں زیادہ حساس تھا۔ ڈوری ٹوٹ گئی اور میرے پاس ڈوری کی گوٹ "نفرت کی گوٹ" رہ گئی جو پھیلتی جا رہی ہے جیسے سات رنگی شفق۔

تم نے روڑے کی ٹھک ٹھک کو محض ٹھاک ٹھاک ہی سمجھا۔ پگلی یہ دل کی دھک دھک تھی اس دھک دھک کو سن کر تم نے اُلٹا چادر اوڑھ لی۔ تم نے سمجھا اس طرح میں تمہیں سویا ہوا سمجھ لیتا۔ اس دھک دھک کی آواز میں اتنی تیزی تھی۔ کہ تمہاری ماں جاگ اٹھی اور اس نے ملحقہ دیوار کی طرف دیکھا اور چیخی "دُر فِٹّے مُنہ"۔ تم پھر بھی سوئی رہیں جیسے تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ کیا تم وہی ولایت نہیں ہو جسنے کہا تھا میں آپ کے ساتھ شادی تو نہیں کر سکتی مگر ساتھ پورا دُوں گی"۔ آج پتہ چلا تمہاری ہر بات فریب میں لپٹی ہوتی تھی اور وعدے۔

"وعدے!" وعدے تو تم نے بڑے بڑے کئے تھے جن کو میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ تمہارے تحت الشعور سے نکل رہے ہیں اور جب تم نے ایک رات رو رو کر اپنی آنکھیں سُرخ کر لی تھیں تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم جھُوٹ سے بکسر مبرّا ہو اور میں بھی رو دیا تھا۔ ایسا شخص رو دیا تھا جو اپنے عزیز ترین معصوم بھائی کی وفات پر ایک آنسو تک نہ گرا سکا تھا۔ آج پتہ چلا تم ولائیت نہیں نفرت کا ڈھیر ہو۔ اور نیچے جھُوٹ کے پلندے دبے ہُوئے ہیں۔

جھُوٹ بھی نہائیت ہی زہریلے قسم کا مگر یہ زہر جو میری ہڈیوں تک میں رچتا چلا جا رہا تھا اس کا ذمہ دار میں خُود ہُوں جس نے دیدہ دانستہ سب کچھ کیا۔ میں نے تم سے کہا میرے ساتھ شادی کر لو تم نے کئی جھُوٹ تراشے۔ میں نے کوئی بات پُوچھی تو تم جواب گول کر گئیں۔ تمہاری عشوہ طرازیوں کا جواب میں نے ہمیشہ منّت سے دیا۔ کبھی تم نے بھی میری کسی ضد کو مانا؟ کبھی تُم نے بھی مجھے اپنانے کی کوشش کی؟ جب ہمارا راز افشا ہُوا تو میں نے تُم سے کہا اگر تُم کہو تو میں دو ایک ماہ کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں؟" اور تم نے بغیر سوچے سمجھے بغیر ہمدردی جتلائے بڑے کورے لہجے میں سر ہلا دیا۔ "ہاں"! تم اتنا تو سمجھتی تھیں جو تمہاری خاطر اتنی قربانی دے رہا ہے اُسے جھُوٹ مُوٹ ہی کے دو میٹھے بول کہہ دوں۔ مجھ ایسے چشماک کے ستائے ہُوئے انسان کے لئے تم ہمدردی اور تسکین کے الفاظ تک نہ کہہ سکیں۔ ولائیت کاش تم مجھے سمجھ سکتیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں تمہیں ایک دوست دیکھنا چاہتا ہُوں

کیونکہ دوست جیسی دُنیا میں کوئی شئے نہیں مگر تم فاسد نیت لئے ہُوئے تھیں۔ تم کیا جانو کسی دوست کی قدر۔

میں نے تمہارے رویے پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ جب میں کچھ دنوں کے لئے باہر چلا آیا تو تم مجھے بھول گئیں۔ میں جس کے بغیر تم ایک منٹ بھی زندہ نہ رہ سکتی تھیں صرف تم سے ملنے کے لئے آیا اور تمہارے نفرت بھرے روکھے رویے نے میرے حوصلے کے پر توڑ ڈالے۔ مجھے خواہ مخواہ احساس ہونے لگا کہ تم نے کسی اور کو اپنا لیا ہے اور شیخ سعدی کا قول میری رگ رگ میں تڑپنے لگا۔ تم نے بہانہ تراشا کہ آج والدہ نہیں ہے۔ والد سوئے ہیں اس لئے والدہ آلے پھر آؤنگی۔ کتنی کچی بات تھی تمہاری کہ تم اُس ہستی کے متعلق کہہ رہی تھیں جس کی نگاہیں ہر وقت تمہارا تعاقب کیا کرتی تھیں۔ اور پھر اگلے دِن جب تمہاری والدہ آگئیں تو تمام رات میں نے تمہارے انتظار میں بسر کر دی۔ تم یہ بتانے تک نہ آسکیں کہ آج میں نہیں آسکوں گی۔ دو منٹ کا راستہ ہی تو تھا۔ دو منٹ کی بات ہی تو تھی۔

اور دوبارہ میں جب کافی دِنوں کے بعد تم سے ملنے کے لئے واپس آیا۔ تو تم پہلے سے کہیں زیادہ کڑوی ہو چکی تھیں۔ تم مجھے دیکھ کر سلام تک نہ کر سکیں۔ تمہارے ہونٹوں پر ذراسی رُوکھی پھیکی مسکراہٹ تک نہ آسکی۔ تمہاری نگاہوں کا جادو، مسکراہٹوں کی بے پناہ لطافت اور معصوم باتیں عنقا تھیں۔ تم میں خلوص کی کمی اور غیض و غضب کی زیادتی تھی۔ دو دِن دو راتیں صدیوں کے دِن اور پہاڑ ایسی راتیں میں نے تمہارے

انتظار میں گزاریں۔ مگر تم نے ایک اشارہ تک نہ کیا۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس کے خطوط کی فائل ابھی تک میرے پاس پڑی ہے؟ کیا تم ایک خط ہی لکھ کر ہی اپنی تکالیف نہیں بتا سکتی تھیں۔ پہلے بھی تو آخر تم ایک ایک بات لکھا کرتی تھیں۔ تم سمجھتی ہو میں کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ہر بات سمجھتا ہوں، جانتا ہوں۔ میں وہ بھی جانتا ہوں جب میں تمہارے مکان کے آگے سے گزر کر جا رہا تھا تو تم نے مجھے دیکھ کر کھڑکی بند کر لی تھی تم سمجھتی ہو میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ تم کھڑکی میں بیٹھی کس کا انتظار کر رہی تھیں۔ تم نے میری شکل تک دیکھنا گوارا نہ کی۔ ولائیت میں وہی ہوں جس کے انتظار میں تم راتیں جاگا کرتی تھیں جس سے تم نے قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ "میں تم سے صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ اور جس کے پہنچنے پر تم بتایا کرتی تھیں آپ اتنے قدم چل کر آئے ہیں۔"

آج تمہیں مجھ سے نفرت ہو گئی ہے اس لئے کہ میں نے تمہیں ہر حالت میں خوش رکھنا چاہا۔ اس لیے کہ میں تمہاری ناشائستہ حرکات برداشت کرتا رہا اس لئے کہ میں نے تمہارے لیے اپنی عزت تک کو بٹہ لگا لیا اس لیے کہ تمہارے لیے زمانے بھر کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اس لئے کہ تمہارے اشاروں پر کوٹھوں تک کی دیواریں پھاندیں۔ اگر تمہارے کہنے پر دیواریں نہ پھاندتا۔ راتوں کو ننگے پاؤں آ کر تم سے نہ ملتا تو کتنے سکھ کی، کتنے چین کی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ میرے معیار سے کتنی گری ہوئی تھیں یہ باتیں مگر تمہیں احساس تک نہیں۔

تمہارے کہنے پر میں نے کئی بار "بھنڈی" کھائی شاید تم آج بھی کہو کہ "میں نے کبھی مجبور نہیں کیا یا کبھی نہیں کہا ہاں اگر آپ نے خواہش ظاہر کی تو انکار نہ ہو سکا" مگر میں کبھی نہیں مانونگا۔ ابتدا تمہیں نے کی تھی۔ ظاہرا نہ سہی اشاروں کنایوں میں بھی تو خواہش کی جھلک نظر آسکتی ہے۔ اور بعد میں ہمارا یہ معمول ہو گیا تھا کہ رات میں دو ایک بار ضرور ملتے۔ اور تم جانتی ہو، یہ ملاپ کیسا تھا؟ کیا یہ ملاپ نہیں تھا جو چاند اور چکور سے منسوب ہے کیا یہ ملاپ وہ نہیں تھا جو لوہے اور مقناطیس سے متعلق ہے ۔۔ جو کچھ بھی ہوا، اس کے متعلق اب کچھ کہنا اچھا نہیں لگتا لیکن میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ تم جو مجھ سے چھٹ کر الگ ہو گئی ہو اب تک میری روح کے ساتھ منسلک ہو۔

آج میں سوچتا ہوں اپنے معیار سے کتنی گری ہوئی باتیں میں محض تمہارے کہنے پر کرتا رہا ہوں۔ اگر تم سمجھتی ہو میری اپنی خواہش ہوتی تھی تو کیا آج اس کے بغیر میں زندہ نہیں ہوں یا اس سے پہلے زندہ نہ تھا۔ جب میں تم سے ملنے آیا تو تمہارے چہرے پر تلخ جذبے کی ایک رَو دوڑ گئی۔ تم نے کہا "مطلب پڑا ہے تو آ گئے ہیں۔ اتنے دن کیوں نہ یاد کیا؟" تم نے یُوں کہا جیسے لق و دق صحرا میں میٹھے پانی کا تنہا چشمہ تم ہی تو ہو جیسے ہوس کی تسکین، درماندہ آرزوؤں کو اطمینان اور آوارہ خیالات کو تھپکیاں دینے کے لئے تمہارا پاس ہونا ہی تو ضروری ہے۔ ولائیت تمہاری زبان کو ایسے الفاظ زیبا نہیں دیتے۔ میں نے تم سے کبھی بھی مطلب

نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ تم سمجھتی ہو اتنے دن میں نے سُکھ سے گزارے ہونگے؟ تُم سمجھتی ہو اتنے دِنوں تم مجھے یاد نہ آئی ہو گی؟ تُم نے یہ کیوں نہ دیکھا غم میری رُوئیں رُوئیں میں رچا ہُوا ہے۔ کاش تُم میری حالت کا اندازہ کر سکو۔ میرے دِل کو ٹٹول کر دیکھ سکو۔ ولائیت تُم اتنی کٹھور اتنی کڑی کیوں ہو گئی ہو؟ آخر تُم نے مجھ میں کیا خامیاں دیکھیں؟ میں نے تُم سے ہمیشہ اپنی خامیوں کے متعلق پوچھا تاکہ انہیں میں دُور کر لوں مگر تُم نے کبھی کچھ نہ بتایا اور شادی سے ہمیشہ انکار کیا۔ بتاؤ مجھے کہ میرے اندر اندوہگین خیالوں نے زبر دست طوفان بپا کر رکھا ہے بتاؤ کہ میری ذہنی گندلاہٹیں دُور ہو جائیں۔

ولائیت! میں نے تمہیں ہمیشہ دوست سمجھا، اپنے غم کا مداوا سمجھا مگر تم میرے جذبات کی قدر نہ کر سکیں۔ میں حسّاس اور جذباتی انسان ہوں۔ ہر کسی کو اپنا سمجھ لیتا ہُوں۔ آج تک کوئی میرا نہیں بنا۔ میں نے تُم سے بارہا کہا، ولائیت تُم مجھے ایک دوست سمجھو میاں بیوی بہن بھائی ماں باپ کسی سے بھی کھُلم کھُلا باتیں نہیں ہو سکتیں جس طرح ایک دوست دوست سے کر سکتا ہے۔ یہ میرے جیسا دوست ہی تھا جس نے بھنڈی کی چپچپاہٹ سے نفرت کے باوجود ہر روز بھنڈی کھائی ہر روز متلی پیدا کر دینے والی چپچپاہٹ کی اذیت سہی۔ یہ بھی میں تسلیم کر ونگا کہ یہ تُم ہی تھیں جس نے مجھے گرم خشک مونگ پھلی تک کھا لینے دی اور جب یوں نہ آسانی سے کھائی گئی تو تیل تک میں بھُونا لی گئی تمہیں اس

سے سخت کوفت ہوتی تھی مگر پھر بھی تم میرے اصرار پر رضامند ہو جاتیں۔ اور لوگ بھی بھنڈی کھاتے ہیں مگر ہماری طرح نہیں۔ تم اس واہیات بھنڈی کی خاطر میرے انتظار میں راتیں گزارا کرتی تھیں۔ کیا عجیب و غریب شوق تھا تمہارا بھی؟ تم آنکھ تک نہ جھپکتی تھیں اور آج میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم آرام سے ٹانگیں پھیلائے پڑی ہوتی ہو۔ تمہیں کسی بات کا ہوش تک نہیں ہوتا۔ ایسا شوق جس میں اتنی شدت ہو۔ کیا اتنی جلد ختم ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ولائیت مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی ولائیت ہو اور یہ دل وہی دل ہے جو رات کے سناٹے میں دھڑکا کرتا تھا۔ تمہاری رگ رگ سے محبت پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی اور آج تم اتنی کوری ہو گئی ہو اتنی چارچشم کہ مجھے دیکھنا تک پسند نہیں کرتیں۔ کیا ہم وہ نہیں رہے جن کے دل رات کی تنہائی میں دھڑکا کرتے تھے؟ کیا ہم وہ نہیں جنہوں نے تمام درمیانی راستے جانے کب عبور کر لئے؟ تمہیں یاد ہوگا ایک دفعہ میں نے کہا تھا ولائیت کہیں مجھے چھوڑ تو نہ دوگی اور تم نے جواب دیا تھا "اب تو اوپر نیچے سے آپ کی ہو گئی ہوں۔" میں نے کہا "مگر اندر سے ابھی تک نہیں۔" اور تم ہنس دی تھیں اب بتاؤ کیا میں نے ٹھیک نہ کہا تھا؟ اب تم میری تسلی کے لئے دو لفظ تک نہیں کہہ سکتیں۔ میری سسکیاں سنتے ہوئے بھی مزے سے خراٹے لیتی رہی ہو خدا کے لئے بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنی سفلی کیوں ہو گئی ہو؟ کیا میں وہی نہیں ہوں؟ کیا میری محبت پہلے سے بھی دگنی نہیں؟ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ اوروں کی محبت دن بدن گھٹتی ہے اور میری محبت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ میں تم کو پہلے

بھی بتا چکا ہوں تُم میرے غم کی مداوا ہو۔ میں نے جتنی محبتیں کیں سب کی تلخیاں تم سے دُور ہو گئی تھیں میں نے تمہیں اپنی ہر محبت کی تفصیل بتائی تھی۔ بتاؤ میں نے کسی ایک سے بھی بے وفائی کی؟ میں نے تُم سے کہا تھا "ولایت جب بھی بیوفائی ہوئی تمہاری طرف سے ہی ہو گی۔ میں تمہیں کبھی دھوکا نہ دُونگا"۔ آج میری کہی ہُوئی باتوں کے متعلق سوچ لو۔ غور کر لو۔ کیا میں نے ایک بات بھی جھُوٹ کہی تھی؟ جھوٹ سے مجھے نفرت ہے میں سچ کہتا ہُوں اور سچ ہی سننا چاہتا ہوں۔ میں نے تُم سے ہمیشہ کہا جو بات ہو۔ مجھے سچ سچ بتا دیا کرو۔ مگر تُم نے سچ سے ہمیشہ گریز کیا۔ میں نے بارہا کہا اگر تمہیں مجھے کل چھوڑنا ہے تو آج ہی بتا دو تاکہ میں تمہیں بھُول جانے کی کوشش کروں۔ مگر تُم نے ہمیشہ فریب سے کام لیا۔ تمہاری چرب زبانی نے مجھے ہمیشہ دھوکا دیا۔

میرا سرمایۂ حیات وہ لمحات ہیں جو تمہارے قرُب میں بسر ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں تمہیں جتنا بھُولنا چاہتا ہوں تُم اتنا ہی یاد آتی ہو۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ ایسی دیرینہ رفاقت کو یکلخت بھُول جاؤں۔ تُم نے میرا کھانا پینا اُٹھنا بیٹھنا سونا سب کچھ حرام کر دیا ہے۔ میرے اطراف کانٹے ہی کانٹے، تلخیاں ہی تلخیاں بچھا دی ہیں۔ نا اُمیدی کے طوفان میں آس کی ایک لہر تک نہیں رہی۔ آخر تمہیں کیا ملا۔ مجھے اس طرح برباد کر کے۔ میں تمہیں بھُول جانا چاہتا ہُوں۔ مجھے تُم سے سخت نفرت ہو گئی ہے مگر دِل! یہ نامراد دِل میری ایک نہیں سُنتا۔ دیدہ دانستہ تمہاری طرف کھینچے لئے جاتا ہے۔ جس رات ڈوری ٹوٹی جس کے ساتھ دوڑا بندھا ہُوا تھا جو تمہاری چارپائی

کی پائنتی سے اٹک گئی تھی یا شاید بعد میں تمہاری ماں نے پکڑلی تھی۔ اس دل کے مجبور کرنے پر ہی میں نے یہ سفلی حرکت کی تھی حالانکہ اس سے پہلے جب تم مجھے بے حد رُوکھے پن سے ملی تھیں تو میں نے دل میں سینکڑوں قسمیں اور گالیاں کھائی تھیں کہ اب تمہیں کبھی نہ بلاؤں گا۔ تم خود ہی آؤ گی تو صُلح ہو گی۔ مگر تم سخت ڈھیٹ نکلیں۔ میں نے دو دن اور دو راتیں یُوں کاٹیں جیسے پھانسی پر لٹکا ہوں۔ انتظار کی تلخی بے حد کڑوی اور کسیلی تھی۔ اور تم خرّے سے سوتی رہیں۔ تمہیں یاد تک نہ آیا کہ میں تمہارے ملنے کے لیے کتنی دُور سے آیا ہوا ہوں اور کس قدر بیتابی سے انتظار کر رہا ہوں۔ تیسری رات میرے دل نے مجھے چین نہ لینے دیا۔ انتظار کا قرب شباب پر پہنچ کر مائل بہ زوال ہو گیا۔ تنہائی کے درد کی ٹیس اُٹھ اُٹھ کر مجھے لرزہ براندام کر رہی تھی۔ جانے کس وقت اُٹھ کر میں نے ڈوری سے روڑا باندھ کر تجھے جگانا شروع کر دیا۔ انتہائی خوف کا نام دلیری ہے۔ تم نے یوں نہ سُنا۔ تو میرا سارا خوف دُور ہو گیا۔ روڑا زور زور سے زمین پر کبھی چارپائی پر بجنے لگا۔ تم بجائے کوئی اشارہ کرنے کے اُلٹا چادر اوڑھ کر پھر لیٹ گئیں۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ دوڑنے کی رفتار اور تیز ہو گئی جس کی کھڑکھڑاہٹ سے تمہاری ماں جاگ اُٹھی۔ تم کہو گی یہ بھی میری غلطی تھی۔ کیا تم ایک ہی روڑے سے نہ جگ جایا کرتی تھیں اور بعض دفعہ بغیر روڑے کے ہی۔ کیا تم آکر تبایا نہ کرتی تھیں۔ آج میں نے اتنے روڑے مارے اگر تم جگ جاتیں یا اشارہ ہی کر دیتیں تو تمہاری ماں کو بھلا کیسے پتہ چلتا۔

مجھے اس بات کا بھی افسوس نہیں کہ تمہاری ماں کو پتہ چل گیا اور اُسنے تمہارے

باپ کو جگا کر ہماری دیوار کی طرف اشارہ کیا کہ ادھر دیکھتا ہے اور ساری کہانی کہہ سنائی آخر پہلے بھی تو محلہ والوں نے دیواریں پھاندتے دیکھا تھا اور تمہارے والدین کو بتایا تھا۔

مجھے افسوس ہے تو صرف تمہارے رویتے پر۔ دنیا میں اتنا کورا کھٹورا انسان بھی کوئی نہ ہو۔ میں نے تمہیں جتنا اچھا سمجھا تم اتنی ہی بُری نکلیں۔ میرا جی چاہتا ہے تمہیں خوب مغلظات سُناؤں، خوب پیٹوں اور پھر میں بیٹھا دیر تک قسمت کو روتا رہوں میں حیران ہوں سخت حیران۔ میری حیرانگی کی کوئی حد نہیں رہی۔ کہاں تم پہلی والی کہاں اب یہ رویہ۔ کہاں ہے وہ چاند جس نے شہادت دینے کی حامی بھری تھی۔ کہاں ہیں وہ تارے جو ہمارے پاسباں ہوئے تھے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ کیا تم نے اپنے متعلق بھی کبھی کچھ سوچا؟ خدا کے لئے ذرا خیال تو کرو تم نے مجھ سے کیا کیا وعدے کئے تھے کس کس طرح یقین دلایا تھا۔

تم مجھے رُوکھے پن سے ملیں اور ایک مہمل سا بہانہ تراشا۔ مجھے اتنا مترود دیکھ کر بھی تمہارا دل نہ پسیجا۔ تم دوبارہ مجھے مل سکتی تھیں۔ میرے اتنے دن باہر رہنے کی وجہ سے سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ سب لوگ ہماری کہانی بھول چکے تھے وہی لوگ جو ہنسی ہنسی میں مجھے کچو کے لگایا کرتے تھے جب میں انہیں ملا تو انہوں نے ہماری اس محبت کے متعلق اشارہ تک نہ کیا مگر تمہاری اپنی نیت خراب تھی۔ تمہاری اپنی اڑچنوں کی وجہ سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ جان بوجھ کر تم مواقع گنواتی رہی ہو۔ تم نے مجھے کہا تھا نا کہ "مطلب پڑا تو آگئے ہیں ورنہ اتنے دنوں میں

کیوں نہ یاد آئی"۔ "ولائیت تم ہمیشہ تنگ نظری، کم ظرفی اور بے انصافی کی راہ پر چلتی رہی ہو۔ ولائیت تمہارے نام میں اتنی فصاحت ہے۔ جانتی ہو ولائیت کے معنی کیا ہیں۔" خدا تعالیٰ سے تقرب ہونا" اپنے نام ہی کی لاج رکھ لیتیں میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں کسی ہوس کا شکار نہیں ہوں۔ تم مجھے کیوں نہیں سمجھتیں؟ پھر تم نے خود ہی تو مجھے باہر جانے کی ترغیب دی میں دو ہی دن کے بعد کیسے چلا آتا۔ اب تم سے ملے ہوئے مجھے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ کیا میں زندہ نہیں ہوں؟ کیا وہ زندہ نہیں ہوتے جنہوں نے کبھی بھنڈی دیکھی تک نہیں چکھی تک نہیں۔ اگر مطلب ہی کی بات تھی تو میں تمہیں سینکڑوں کہانیاں سنا چکا تھا جہاں سے میں ہر لمحہ مطلب نکال سکتا تھا اور نکال سکتا ہوں۔

ولائیت! تم نے مجھے سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ خدا شاہد ہے میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہ کہا میں نے شائد تمہیں وہ رقعے نہیں دکھلائے تھے جو تمہارے روٹھے پن سے ملنے سے دو دن پہلے اس عصمت باختہ لڑکی کی چھوٹی بہن سے مجھے ملے تھے جس کے سینکڑوں پیغام مجھے پہلے بھی آ چکے ہیں اور جو آج بھی اپنے دروازے میں کھڑی میرا انتظار کیا کرتی ہے۔ کیا وہ لڑکی مجھے بھنڈی نہیں کھلا سکتی؟ تم خواہ مخواہ ایک معمولی سی بات پر مجھ پر اعتراض کیا کرتی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی مطلب ہوا؟ مجھے اس لڑکی کی چھوٹی بہن سینکڑوں پیغام دیتی رہی ہے مگر مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ میں نے اُن کا کبھی جواب نہیں دیا۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں آج بھی کل بھی آئندہ بھی۔ مگر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کیوں نہ اپنے غم کی کوئی اور دوا ڈھونڈ لوں جس طرح

تم کسی اور کے لئے کھڑکی کھولے بیٹھ سکتی ہو۔ کیا میں بھی اپنے دل کی کھڑکی کھول کے نہیں بیٹھ سکتا؟ کیا میں بھی اپنا مطلب نہیں نکال سکتا؟ اگر تم کجروی کر سکتی ہو، دل آزار باتیں کر سکتی ہو، تریا چرتر کر سکتی ہو تو کیا میں اپنی چال نہیں بدل سکتا؟

مگر یہ مداوا میرے لئے ہمیشہ زہر میں بجھا ہوا تیر نکلا ہے۔ مجھے متعدد مرتبہ زک اٹھانی پڑی ہے۔ اس نے ان گڑھوں اور راستوں کو اور زیادہ مخدوش اور ڈراؤنا بنا دیا ہے جو پہلے ہی پرخطر اور خوفناک تھے۔ اس لئے سوچتا ہوں یونہی زندگی بسر کرتا چلا جاؤں مگر اپنے بس میں کچھ نہیں۔ اس تاریکی اور گھٹن سے مجھے سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ تم سے پہلے مجھے حامی ملی، حمیدہ ملی، چھیماں ملی، نوراں ملی مگر سب ایک سے ایک بڑھ کر زہریلا تیر نکلیں۔ اے فریب کے ڈھیرو، اے جھوٹ کے پلندو، کیا تمہارے پاس دھوکے اور ریا کاری کے سوا کچھ نہیں؟ کیا تم دوسروں کو برباد کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا کبھی کسی سے فریب نہیں کیا اور میرے ساتھ کبھی کسی نے صاف دلی سے بات نہیں کی۔ لوگ سمجھتے ہیں میں ہرجائی ہوں میرا اصول "یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" ہے۔ مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے کبھی ایسا نہیں کیا میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا۔ ہاں پچھلے غم کی دوا ضرور چاہتا ہوں۔ اب تم نے جانکاہ غم مجھے دے دیا ہے یہ میری طاقت سے باہر ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس کا مداوا چاہتا ہوں۔ بعض دفعہ میں نے تمہاری ایسی ایسی حرکات دیکھی ہیں کہ اگر اس وقت میری جیب میں

زہر ہوتا تو یقیناً کھا گیا ہوتا۔

تُم مزے سے زندگی بسر کر رہی ہو اور میں عجیب و غریب جھنجٹ میں پھنسا ہُوں۔ کبھی اپنے غم کا مداوا چاہتا ہُوں کبھی یونہی بسر کر لینے کی ٹھان لیتا ہُوں کیونکہ یہ مداوا تا ابد رہنے والا نہیں ہوتا۔ یہ چند دِنوں کے لیئے ہے یا چند لمحوں کے لئے جیسے شراب کا نشہ اور پھر وہی بے رنگی اور بے کیفی۔ وہی تلخی وہی کانٹے۔ میں سوچتا ہُوں اِس دنیا میں کیوں محبت کا عشر عشیر تک نہیں ملتا ہمدردی کی ایک جھلک تک نظر نہیں آتی۔ "مطلب" ہر جگہ مطلب ہی مطلب ہے۔ کوئی کام کوئی بات مطلب کے بغیر نہیں۔ محبت اور شرافت کا تو کال پڑا ہے۔ کاش میں بھی مطلبی ہوتا جھوٹا ہوتا، فریب کا ڈھیر ہوتا تو آج میرے کان نہ بجتے۔ میری فریادیں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا واپس نہ آتیں۔

میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہُوں۔ ابھی مَیں نے تُم سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس سے کہیں طویل تمہارے خط میں نے فائل کئے ہُوئے ہیں۔ مگر میں تُم سے کیوں کہنا چاہتا ہُوں؟ آخر کیوں کہوں؟ جس کو خود احساس نہ ہو اُس سے کہنے کا فایدہ؟ تم جو سب کچھ میرے متعلق جانتی ہو تم سے کچھ کہوں؟ تم جو میرے جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا میرے سینے پر سر رکھ کر شور بار ہا سن چکی ہو، تم سے کہوں؟ کیوں؟ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں کہونگا میں یونہی گھُٹ گھُٹ کر مر جاؤنگا مگر تُم سے کچھ نہیں کہونگا۔ میں نا اُمید ہو چکا ہُوں "نا امیدی" اُف کتنا ہیتناک اور ڈراؤنا تصوّر ہے۔ میں جب بھی تمہارے سامنے

آؤں گا ہنسوں گا، قہقہے لگاؤں گا۔ تم سمجھو گی میں بہت خوش ہوں مگر میرے اندر شعلے بھڑک رہے ہونگے اور میں کہہ رہا ہونگا "اے دِل کی آرزوؤ آؤ تمہیں گورِ حسرت میں دفن کردوں"۔ تم خوش رہو۔ میں تمہیں دِل سے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ایک چھوڑ دس دوست بنالو۔ اگر تمہاری اس میں خوشی ہے تو میں خوش ہوں۔ اپنے لیئے نہیں تمہارے لیئے۔

تُم سے نفرت کرتے ہُوئے تمہیں اتنا بُرا سمجھتے ہُوئے تمہیں پیٹنے کو جی چاہتے ہُوئے بھی میرا دل تمہارے ساتھ ہے۔ تمہاری ہر حرکت پہ دھڑک اُٹھتا ہے میں نہیں جانتا کیوں۔ میں جتنا تمہیں بُرا سمجھتا ہوں دِل اُتنا ہی تمہاری طرف کھینچتا ہے۔ میں تمہیں بھول جانا چاہتا ہوں اور یہ دِل بیتے ہُوئے دِنوں کی تصویر میرے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ یہ عقدہ لاینحل میری سمجھ سے بعید ہے۔ یہ کڑوی کسیلی گھڑیاں جانے کب بیتیں گی۔ جانے کب بیتیں گی۔

تمہیں یہ دِل نامراد جانے کیوں خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ جبکہ خود دُکھ سے بھرا پڑا ہے۔ میں تمہیں نفرت کرتے ہُوئے بھی کیوں چاہتا ہوں۔ تم کو پیٹنے کی خواہش لیئے ہُوئے بھی کیوں پیار کرتا ہوں۔ تمہیں کبھی نہ بلانے کبھی خط نہ لکھنے کی بڑی بڑی قسمیں کھا کر بھی کیوں خط لکھ رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا میں شاید پاگل ہو گیا ہوں ولایت خدا کے لیئے اپنے وعدے یاد کرو۔

جانے کب تک میں اس پتھر کی مورت کے سامنے جبیں سائی کرتا رہونگا۔

سلمیٰ پبلیکیشنز

شاہدرہ لاہور

اختر سلیمی

بڑا فنکار ہے

کیوں؟

گرتی دیواریں

ریڈیائی ڈرامے اس کا بیّن ثبوت ہیں

(زیر طبع)

نیا ناشر لاہور

سفینہ اور کنارے

ایسا ناول ہے جسے شریف گھرانوں کے لوگ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں

اس میں درد کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہے

سفینے کو ہمیشہ کنارے کی تلاش رہی ہے۔ میرا سفینہ

کناروں سے دُور بھاگتا ہے

کیوں؟

اُختر سلیمی

نے اِس گتھی کو نہائیت خوبصورت طریقے سے سُلجھایا ہے

(زیر طبع)

نیا ناشر لاہور